علمی، ادبی، دینی، وتبلیغی رسالہ

ماہنامہ آگرہ

اذان بلال

جلد ۳۷ شمارہ: ۱۱، ۱۲

ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ ۱۴۴۷ھ مطابق نومبر، دسمبر ۲۰۲۵ء

مدیر: ابوالبرکات مظاہری

بیادگار

حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ

سرپرست

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

موبائل نمبر: 9557358285
9411401142

فون: ۰۵۶۲-۲۵۲۰۷۴۸

زرتعاون ہندوستان سے

فی شمارہ............۲۵روپے
سالانہ..........۲۵۰روپے
خصوصی.........۲۰۰۰روپے
سہ سالہ.........۷۵۰روپے
لائف ممبری.....۱۰۰۰۰روپے

بیرون ممالک

۵۰ امریکی ڈالر کے مساوی

مجلس ادارت

اساتذۂ دارالعلوم آگرہ

اس دائرہ میں سرخ نشان علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی، آئندہ کے لئے براہ کرم رقم ارسال فرمادیں

خط وکتابت کا پتہ: منیجر ''اذان بلال'' دارالعلوم آگرہ محلّہ پیر جیلانی آگرہ-۴

اس شمارے میں

نمبر شمار	فہرست مضامین	مضمون نگار	صفحہ
۱	ہمدردی یا گناہ	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب	۵
۲	علمی معجزہ	حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ	۱۰
۳	تصوف وسلوک	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۲۴
۴	فقہ وفتاوی	مولانا مفتی احمد خانپوری	۲۹
۵	انسان کا اجتماعی مزاج	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۳۶
۶	عظمتِ قرآن	مولانا بلال حسنی ندوی	۴۱
۷	حکمِ خدا کی اہمیت	پیر ذوالفقار احمد نقشبندی	۴۵
۸	خبرنامہ	ادارہ	۵۸

Printed at : Rabbani Printers Katra Sheikh Chand Lal Kuan Delhi.110006
Published by:Abul Barakaat Mazahiri Darul Uloom Agra Peer Jilani Agra-4.

مضمون نگار کی ہر بات سے ادارہ ''اذان بلال'' کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ

پرنٹر پبلیشر ابوالبرکات مظاہری نے ربانی پرنٹرس کٹرہ شیخ چاند لال کنواں دہلی سے چھپوا کر ''دفتر اذان بلال'' دارالعلوم آگرہ محلّہ پیر جیلانی آگرہ نمبر۔۴۔ یوپی (انڈیا) سے شائع کیا۔

ہمدردی یا گناہ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب

ایک صاحب ایک مرتبہ مجھ سے اپنے پڑوسی کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتا رہے تھے کہ ان کے آپس میں کتنے خوشگوار تعلقات ہیں، اور وہ کس طرح ایک دوسرے اپنائیت اور ''حسن سلوک'' کا معاملہ کرتے رہتے ہیں، اس ''حسنِ سلوک'' کی تفصیل بیان کرتے ہوئے وہ کہنے لگے کہ ''میرے پڑوسی جس محکمے میں کام کرتے ہیں وہ اپنے ملازمین کو ان کی ذاتی گاڑی کے لیے بہت سی سہولیات فراہم کرتا ہے، (مثلاً پیٹرول کا خرچ، سروس اور مرمت وغیرہ کا خرچ) میرے پڑوسی کے پاس چوں کہ اپنی کوئی گاڑی نہیں تھی، اس لیے وہ یہ سہولیات حاصل نہیں کر سکتے تھے، میں نے اپنے گاڑی ان کے نام رجسٹر کرادی، اور انہوں نے اپنے محکمے میں سے اپنی گاڑی ظاہر کر کے وہ سہولیات حاصل کر لیں، مدتوں میری گاڑی ان کے نام پر درج رہی، اور وہ اس کے نام پر سالہا سال یہ سہولیات حاصل کرتے رہے'' میں نے ان سے پوچھا کہ ''آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' وہ فرمانے لگے کہ ''ہمارے درمیان تعلقات ہی ایسے تھے'' مجھے یقین تھا کہ گاڑی ان کے نام رجسٹر ہونے کے باوجود میرے ہی استعمال میں رہے گی، اور کبھی ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں ہوگا، لہٰذا اگر صرف نام درج کرانے سے کسی کا بھلا ہوتا ہو تو میں کیوں اس میں رکاوٹ بنو؟''

ایک اور صاحب نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست کے ساتھ ''حسنِ سلوک'' کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ''ہمارے درمیان اتنے اچھے تعلقات ہیں کہ جب وہ خود یا ان کے گھر کا کوئی فرد بیمار ہوتا ہے تو میں ڈاکٹر سے اپنے نام کا نسخہ بنوا کر اپنے محکمے میں خرچ پر دوائیں لے آتا ہوں،

اور اپنے دوست کو فراہم کر دیتا ہوں، اور اس طرح علاج معالجے پر میرے دوست کا کبھی کچھ خرچ نہیں ہوتا''

دونوں صاحبان نے اپنا یہ عمل بڑے فخر کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا جیسے یہ ان کی کشادہ دلی اور بلند حوصلگی کی علامت ہے، اور اس کے ذریعہ انہوں نے بہت بڑی نیکی انجام دی ہے جس پر وہ دنیا میں تعریف اور آخرت میں ثواب کے مستحق ہیں، یہ دونوں میں سے کسی نے نہیں سوچا کہ اس طرح اپنے پڑوسی یا دوست کے ساتھ ''ہمدردی'' کا آغاز تو جھوٹ بولنے سے ہوا، یعنی پہلے صاحب نے اپنی کار خلافِ واقعہ اپنے پڑوسی کے نام درج کرا کے غلط بیانی سے کام لیا، بلکہ غلط بیانیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کرادیا، کیوں کہ ہر مہینے وہ صاحب اپنی اس فرضی گاڑی کے لیے پیٹرول کے فرضی بل داخل کرتے تھے، جن میں سے ہر فرضی بل ایک مستقل جھوٹ تھا، اسی طرح اس فرضی گاڑی کی سروس اور مرمت کے بھی اسی طرح فرضی بل بنائے جاتے ہوں گے، کیوں کہ گاڑی تو بدستور پہلے صاحب ہی کے استعمال میں تھی، اس طرح اس ہمدردی کی بدولت وہ سالہا سال تک جھوٹ کا یہ پلندہ اپنے نامۂ اعمال میں درج کراتے رہے، اسی طرح دوسرے صاحب اپنے دوست کی بیماری کے موقع پر خود اپنے آپ کو بیمار ظاہر کرنے کے لیے اپنے لیے فرضی نسخے بنواتے رہے، اور ڈاکٹر صاحب کو بھی اس غلط بیانی میں ملوث کرتے رہے۔

دوسری طرف محکمہ نے اگر کوئی سہولت اپنے کسی کارندے کو دے رکھی ہے تو وہ اپنے ملازم کو دی ہے، جو کچھ قواعد وضوابط کی پابندی ہے، نہ کسی شخص کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی یہ سہولت کسی اور کو منتقل کر دے، اور نہ یہ جائز ہے کہ قواعد وضوابط کے خلاف جس طرح چاہے وہ سہولت حاصل کرلے، لہٰذا دونو صاحبان نے جو سہولتیں اپنے پڑوسی یا دوست کو دلوائیں، وہ ان کے لیے سراسر حرام اور ناجائز تھیں، لیکن دونوں کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ اس طرح وہ کسی جرم یا گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں، اس کے برعکس وہ اسے اپنی نیکیوں میں شمار کر رہے

تھے۔

یہ دو واقعات تو میں نے مثال کے طور پر ذکر کر دیئے، ورنہ اپنے گرد و پیش میں نظر دوڑا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا معاشرہ اس قسم کے واقعات سے بھرا ہوا ہے، کوئی سرکاری یا غیر سرکاری محکمہ اپنے ملازمین کو جو سہولیات دیتا ہے، بعض لوگ انہیں ہر قیمت پر اپنے حق میں نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ اس کے لیے جھوٹ سچ ایک کرنا پڑے، یا قواعد وضوابط توڑنے پڑیں، یا کسی اور بدعنوانی کا ارتکاب کرنا پڑے، مثلاً بعض محکموں میں یہ قاعدہ ہے کہ وہ اپنے ملازمین کو گاڑی میں استعمال کرنے کے لیے ایک خاص حد تک پیٹرول کی قیمت مہیا کرتے ہیں، اب بعض لوگ ہر مہینے اتنے پیٹرول کے بل داخل کر کے یہ رقم ہر حالت میں وصول کرنا ضروری سمجھتے ہیں خواہ واقعۃً اس مہینے میں اتنا پیٹرول استعمال ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اسی طرح بعض ملازمین کو محکمے کی طرف سے اجازت ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص ماہانہ کرایہ کی حد تک کوئی مکان اپنی رہائش کے لیے لے سکتے ہیں، اب خواہ مکان کم کرائے پر ملا ہو، لیکن وہ زائد کرائے کا بل بنوا کر پوری رقم وصول کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اسی طرح بعض مرتبہ مکان کی مرمت یا دیکھ بھال (Maintenance) کا خرچ محکمہ برداشت کرتا ہے، چناں چہ بعض لوگ مرمت کے فرضی بل بنوا کر یہ رقمیں وصول کرتے رہتے ہیں، یہی معاملہ علاج معالجے کے اخراجات کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ خواہ واقعۃً کسی علاج کی ضرورت نہ پڑی ہو، لیکن جعلی بل بنوا کر علاج کا خرچ وصول کر لیا جاتا ہے۔

یہ تمام صورتیں بڑی گھٹیا قسم کی بددیانتی میں شامل ہیں، اس سلسلے میں ایک اہم شرعی اصول کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے جو بہت کم حضرات کو معلوم ہوتا ہے، اس لیے بعض اوقات اچھے خاصے دیانت دار حضرات کو بھی غیر شعوری طور پر اس قسم کی بددیانتی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہ اصول یہ ہے کہ کسی چیز کی ملکیت اور چیز ہے، اور استعمال کی اجازت اور چیز، جو چیز اپنی ملکیت

میں آ جائے، اسے تو انسان جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے، خواہ خود اس سے فائدہ اٹھائے، کسی اور کو عاضی یا مستقل استعمال کے لیے دے دے، اس پر کوئی پابندی نہیں لیکن جو چیز اپنی ملکیت میں نہ ہو، بلکہ مالک نے اسے استعمال کرنے کا حق یا اس کی اجازت دی ہو، (جسے اسلامی فقہ میں ''اباحت'' سے تعبیر کیا گیا ہے) اس پر ہر طرح کے مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ اس اجازت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی ضرورت کی حد تک اسے جس قدر استعمال کرنا چاہے کر لے، لیکن اسے یہ اجازت نہیں ہوتی کہ وہ مالک کی اجازت کے بغیر اپنا یہ حق کسی اور کو منتقل کر دے، یا دوسروں کو دعوت دے کہ اس سے فائدہ اٹھانے میں وہ بھی اس کے ساتھ شریک ہو جائیں، نیز اسے یہ بھی حق نہیں ہوتا کہ اگر کسی وجہ سے وہ خود اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا تو اس کی قیمت وصول کرے۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ہمارے گھر کھانا پکا کر بھیج دیا تو یہ کھانا ہماری ملکیت ہے، خواہ ہم اسے خود کھائیں یا کسی اور کو تحفۃً بھیج دیں، یا صدقہ کر دیں، بلکہ جائز یہ بھی ہے کہ کسی کو بیچ کر اس کی قیمت وصول کر لیں، لیکن اگر کسی شخص نے اپنے گھر میں ہماری دعوت کی تو جو کھانا وہاں موجود ہے، وہ ہماری ملکیت نہیں، البتہ مالک کی طرف سے اجازت ہے کہ ہم اپنی ضروریات یا خواہش کے مطابق جتنا چاہیں کھالیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس اجازت کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اس کھانے پر اپنے مالکانہ حقوق جتلانے لگیں، لہذا یہ جائز نہیں ہے کہ ہم مالک کی مرضی کے بغیر اس پر کسی اور کو دعوت دینے لگیں، اسی طرح اگر کوئی شخص دعوت کا کھانا اپنے ساتھ باندھ کر گھر لے جانے لگے تو اسے کتنا گھٹیا آدمی سمجھا جائے گا، اور اس سے بھی زیادہ گھٹیا اور شرمناک بات یہ ہوگی کہ کوئی شخص اگر خود کسی وجہ سے کھانا نہ کھا سکا تو میزبان سے یہ مطالبہ کرے کہ میرے کھانے کے پیسے ادا کرو۔

بالکل یہی صورت ملازمت سے حاصل ہونے والی سہولیات کی بھی ہے، جہاں تک فقط تنخواہ

کا تعلق ہے، وہ ملازم کی ملکیت ہے، اسے وہ جس طرح چاہے استعمال کرسکتا ہے، یا جو الاؤنس کی رقمیں یکمشت محکمے کی طرف سے ادا کر دی جاتی ہیں اور ان کی وصولیابی کے لیے بل پیش کرنے نہیں پڑتے، ان کا بھی یہی حکم ہے، لیکن جو دوسری سہولیات ملازم کو فراہم کی جاتی ہیں مثلاً پیٹرول، علاج معالجے اور کرائے وغیرہ کے لیے بلوں کی ادائیگی، وہ محکمے کی طرف سے ایک اجازت ہے، لہذا اس کا مطالبہ اسی حد تک جائز ہے اور درست ہے جس حد تک اس اجازت سے واقعی فائدہ اٹھایا گیا ہے، اس سے زیادہ نہیں، اس فائدے میں اپنے کسی عزیز، دوست یا پڑوسی کو شریک کرنا بھی جائز نہیں، اسی طرح اگر خود کو اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، یا اس کا موقع نہیں ملا، تو اس کا غلط بل پیش کر کے پیسے وصول کرنا بھی سراسر ناجائز ہے، اور اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص دعوت میں شریک نہ ہو، اور داعی کے پاس اس وقت کے کھانے کا بل بھیج دے، کہ میں چوں کہ دعوت سے فائدہ نہیں اٹھا سکا، اس لیے یہ بل تم ادا کرو۔ ظاہر ہے کہ کوئی گھٹیا سے گھٹیا آدمی بھی ایسی حرکت نہیں کرے گا، مذکورہ سہولیات سے فائدہ اٹھائے بغیر ان کا بل محکمے کو بھیج دینا بھی ایسی ہی شرمناک حرکت ہے لیکن افسوس ہے کہ اس کی برائی عام طور سے محسوس نہیں کی جاتی، بلکہ اسے اپنا حق سمجھا جاتا ہے، حالاں کہ اس میں جھوٹ اور فریب کا گناہ بھی ہے، اور دوسرے کا مال ناحق کھانے کا گناہ بھی۔

اس صورتِ حال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ روپیہ پیسہ اور مادی منافع کو زندگی کا وہ بنیادی مقصد قرار دے لیا گیا ہے جس کے آگے دینی، اخلاقی اور روحانی قدریں اور ملک وملت کی اجتماعی فلاح و بہبود کی فکر یا تو بے معنی ہو کر رہ گئی ہے، یا پس منظر میں چلی گئی ہے، یہ درست ہے کہ معاشرے کا عمومی مزاج راتوں رات تبدیل نہیں ہوسکتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس شخص کو اللہ تعالی نے ضمیر کی پاکیزگی عطا فرمائی ہو، وہ اس ماحول سے شکست کھا کر بیٹھ جائے، حسنِ کردار ایک خوشبو ہے جو بالآخر پھیل کر رہتی ہے۔ ☆☆☆

قسط دوم

علمی معجزہ

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

معرفت اوصافِ متکلم

وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر کلام میں متکلم کے اثرات چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلام کو پڑھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ کسی عالم کا کلام ہے یا جاہل کا؟ شاعر کا ہے یا غیر شاعر کا؟ اس کے کلام کے طرزِ بیان اور مضامین کو دیکھ کر آپ پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں شخص کا کلام ہے یا ایسے شخص کا جس میں فلاں صفت غالب ہے۔ غرض کلام میں متکلم کے اثرات غالب ہوتے ہیں بلکہ کلام میں خود متکلم چھپا ہوا ہوتا ہے۔ اگر متکلم کو دیکھنا ہو اس کا کلام پڑھ لو تو اس کی کیفیت عیاں ہو جائے گی۔

اورنگ زیب کی بیٹی ''زیب النساء'' یہ بڑی شاعرہ تھی۔ اس کا کلام بہترین ہوتا تھا۔ مشاعرے جب ہوتے تھے تو اس کا کلام بھی پڑھا جاتا تھا۔ تو عاقل خان جو اورنگ زیب کے زمانے کا بڑا عہدہ دار بھی تھا اور بڑا شاعر بھی تھا۔ اس کی زبان سے کہیں یہ جملہ نکلا کہ کاش میں اس شاعرہ کو کہیں دیکھتا جس کا اتنا اونچا کلام ہے اتنی اس میں بلاغت ہے یہ جملہ زیب النساء کو پہنچا۔ زیب النساء نے اس کا جواب ایک شعر میں دیا کہ اگر تو مجھے دیکھنا چاہتا ہے تو دیکھ سکتا ہے۔ میں اس کی تدبیر بتلائے دیتی ہوں۔ اس نے یہ شعر لکھ کر بھیجا کہ ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل

میں اپنے کلام میں اس طرح سے چھپی ہوئی ہوں جس طرح سے گلاب کی پنکھڑیوں میں خوشبو چھپی ہوتی ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگِ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

جو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے وہ میرے کلام میں مجھے دیکھ لے، میں نمایاں ہو جاؤں گی۔

غرض ہر کلام میں متکلم کے اوصاف چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ شعراء کے کلام کی فصاحت و بلاغت کے درجات آپ اسی طرح سے قائم کرتے ہیں کہ اگر بہت اونچا شعر ہے آپ کہتے ہیں کہ کسی بڑے اونچے شاعر کا ہے، اگر معمولی کلام ہے آپ کہتے ہیں کہ ہاں تک بندی ہے۔

ایک بات مجھے یاد آئی کہ ہماری اردو زبان میں ایک محاورہ ہے ''آنکھیں چار ہونا'' اور یہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جب محبت کا اشارہ کنایہ کرنا ہوتا ہے۔ اس محاورے کو استاذ ذوق نے نظم کیا ہے کہ

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ وجدل میں مارا

ایک دوسرا شاعر ہندو اس نے بھی یہی مضمون بیان کیا۔ مگر اس مضمون کو اونچا کر دیا۔ وہ کہتا ہے

دل کی نہیں تقصیر مکند، آنکھیں ہیں ظالم
یہ جاکے نہ لڑتیں وہ گرفتار نہ ہوتا

یہ ایک ہی بات دو شعروں میں ادا کی گئی۔ مگر جاننے والوں نے جان لیا کہ اس مضمون کو دوسرے شعر میں جس پیرائے میں ادا کیا گیا ہے وہ بنسبت پہلے پیرائے کے بلند پیرایہ ہے۔ تو

کلام کے اندر فصاحت اور بلاغت کے لحاظ سے مراتب اور تفاوت فصحاء و بلغاء سمجھتے ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ یہ بہترین کلام ہے اس سے زیادہ بہتر دوسرا نہیں ہوسکتا۔ جب انسانوں کے کلام میں ایسے درجات نکلتے ہیں کہ بعض موقعوں پر لوگ کہتے کہ یہ سہل ممتنع ہے اس سے آگے اب بہتر نہیں ہوسکتا۔

متکلمِ حقیقی

تو اللہ کے کلام میں یہ چیز بدرجۂ اولیٰ پائی جانی چاہئے۔ جب وہ کلام کرے تو اس درجے کا بدیع ہو کہ اس سے بہتر ناممکن ہو۔ انسانی کلام کتنا ہی بدیع ہو مگر اس سے بہتر ممکن تو ہوگا اس لیے کہ یہ ممکن ہے کہ اس سے بہتر فصیح و بلیغ انسان پیدا ہو جائے۔ لیکن اللہ جو کام کرے گا یا کلام فرمائے گا اس سے بہتر یوں ممکن نہیں کہ نہ خدا کا نظیر ہے نہ اس کے کلام کا نظیر ہوسکتا ہے نہ اس کے لیے کوئی مثل ہے نہ اس کے کلام کا کوئی مثل ہوسکتا ہے۔ اس لیے فرمادیا گیا کہ **لا یاتون بمثلہ** اس کے کلام کا مثل کوئی نہیں لاسکتا۔ اس لیے کہ اس کی ذات و صفات کا مثل کوئی موجود نہیں۔

لیس کمثله شیء وهو السمیع البصیر

اس کی ذات کی کوئی مثل اور نظیر نہیں ہے، وہ سمیع اور بصیر ہے۔

جب ذات بے چوں اور بے چگون ہے اور صفات کی کوئی نظیر نہیں ہے تو پھر افعال کی کوئی نظیر کیسے ہوگی؟ تو صفات میں سے کلام بھی ہے۔ کلام کرنے کا حق تو اللہ ہی کا ہے۔ ہم اور آپ متکلم تو اس کے پرتو سے بن گئے ہیں اگر کلام کا پرتو نہ پڑے تو ہمیں متکلم ہونا نصیب نہیں ہوسکتا۔ سمع اور بصر اس کی صفت ہے۔ اس کا پرتو تو پڑا تو ہم بھی سمیع اور بصیر کہلائے۔ موجود حقیقی وہ ہے۔ اس کے وجود کا پرتو تو پڑ گیا تو ہم بھی موجود کہلانے لگے۔ ورنہ ہم میں کوئی اپنا ذاتی اور اصلی

وجود نہیں ہے۔ تو جب ہماری ہر چیز حق تعالیٰ کے پرتو سے ہے اصل صفات اس کی ظلی صفات ہماری ہیں اصل وجود اس کا ظلی وجود ہمارا اصل کلام اس کا ظلی کلام ہمارا تو اصل فصاحت وبلاغت اس کی ہوگی ہماری فصاحت وبلاغت ظلی ہوگی۔

غرض جب اصل فصاحت وبلاغت ہمارے اندر ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ ایک کا ظل دوسرے ظل کے مشابہ ہوسکتا ہے۔ اصل کے مشابہ تو جب ہو جب کوئی دوسرا اصل پیدا ہو اور اصل ایک ہے تو اصل کلام ایک ہی رہے گا۔

حق تعالیٰ شانہ نے حقیقت میں جیسے افعال کے معجزے ظاہر فرمائے۔ زمین ایک معجزہ ہے، آسمان ایک معجزہ ہے، چاند اور سورج ایک معجزہ کہ جن کی نظیر لانے کی کسی کو قدرت نہیں، تو کلام کا معجزہ بھی ظاہر فرمایا اور وہ قرآن کریم ہے جس کا مثل ناممکن تھا۔ نہیں لایا گیا اور آج تک نہیں لایا گیا۔

دنیا کی اقوام نے دن رات مقابلے کئے مگر اس جیسا کلام لاکر پیش کر دیں جس میں ویسی ہی معنویت ہو اتنے ہی پہلو بھرے ہوئے ہوں، اتنی ہی جامعیت ہو اور اتنی ہی فصاحت وبلاغت ہو یہ کوئی نہ کرسکا۔ یہ اس کی دلیل ہے کہ یہ معجزہ ہے یعنی خدا کا کلام ہے بشر کا کلام نہیں ہے۔

قرآن کریم کی اعجاز نمائی

پھر یہ معجزہ ہی نہیں بلکہ معجزہ گر بھی ہے۔ یعنی قرآن کریم نے معجزات بنا دیئے اس واسطے کہ قرآن کریم پر عمل کرنے سے بڑے بڑے اکابر اولیاء پیدا ہوئے ان اولیاء کے ہاتھ پر کرامتیں ظاہر ہوئیں تو قرآن خود ہی معجزہ نہیں ہے۔ بلکہ لوگوں کے ہاتھ پر معجزے نمایاں بھی کرتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ نبی کے ہاتھ پر جو خرقِ عادت ظاہر ہوتی ہے اسے معجزہ کہتے ہیں۔ ولی کے ہاتھ پر

خرقِ عادت ظاہر ہوا سے کرامت کہتے ہیں۔ ابی حنیفہؒ سفیان ثوریؒ وغیرہ یہ اکابر مجتہدین گذرے ہیں یہ انبیاء نہیں تھے مگر نبیوں جیسے کام کئے ایک ایک نے کروڑوں انسانوں کے دلوں کو ایمان سے رنگا اور ایک ایک خطہ کو ایمان واسلام سے رنگین بنا دیا۔

صوفیاء کے طبقے پر نگاہ ڈالو ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیریؒ کے بارے میں کسی مسلمان کی نہیں بلکہ ایک عیسائی کی شہادت ہے۔ جس کا نام مسٹر آرنلڈ ہے، اس نے پریچنگ آف اسلام کتاب لکھی ہے وہ لکھتا ہے کہ ایک حضرت شیخ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دست مبارک پر ننانوے لاکھ آدمیوں نے ہندوستان میں اسلام قبول کیا ہے۔ تو ایک فرد نے ننانوے لاکھ کو مسلم بنایا۔ خود حضرت شیخ کے خلفاء کے ہاتھ پر جو لوگ اسلام لائے، ان کی تعداد الگ ہے، تو ایک شیخ معین الدینؒ نے وہ کام کیا جو انبیاء بنی اسرائیل کرتے تھے کہ جس خطے میں بیٹھ گئے، لاکھوں اور کروڑوں کو باایمان بنایا۔ ایمان کی روشنی پیدا کر دی۔

تو جناب رسول اللہ ﷺ کے اس معجزے اور اس پر عمل کی بدولت لوگ ایسے مقامات پر پہنچے، ولایت کے ان مرتبوں پر پہنچے جن کے ہاتھوں پر خرقِ عادت اور کرامتیں ظاہر ہوئیں، الہامات ظاہر ہوئے۔

شرائع ظلیہ

یہ جتنے ائمہ مجتہدین ہیں اگر انبیاء علیہم السلام پر اصلی شریعتیں ظاہر ہوئیں تو ان مجتہدین کے قلوب پر ظلی شریعتیں ظاہر ہوئیں۔ یعنی انہوں نے ان ہی شریعتوں میں سے استنباط کر کے مستقل احکام دئے۔ انہی شریعتوں میں اجتہاد کر کے احکام نکالے اور کتابوں کی کتابیں بھر دیں۔

یہ کتاب وسنت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے۔ کتاب وسنت کی کلیات میں جو چیزیں چھپی

پڑی تھیں۔ مجتہد کے فہم نے ان کو اندر سے نکال کر کے نمایاں کر دیا۔ یہ الہامی چیزیں تھیں۔ حق تعالی نے ان کے قلوب میں ڈالیں، انہوں نے ان کو واضح کر دیا۔

امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ

مجھے امام احمد بن حنبلؒ جو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں کا واقعہ یاد آیا، استاذ بھی امام ہیں اور شاگرد بھی امام ہیں۔ اور دونوں صاحبِ مذہب اور صاحبِ فقہ ہیں۔ امام شافعیؒ کا فقہ حجاز میں پھیلا اس لیے کہ اس کی ابتداء حجاز میں ہوئی انتہاء مصر میں جا کر ہوئی مصر کی اکثریت شوافع کی ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ مغربی ممالک کی طرف گئے۔ تو نجد اور یمن کے اندر حنبلیت پھیلی ہوئی ہے۔ لاکھوں انسان فقہ حنبلی پر چل رہے ہیں۔

چوں کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا اخیر زمانہ مصر میں گذرا ہے اور امام احمدؒ سے ملاقات کئے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ تو امام شافعیؒ نے احمد بن حنبلؒ کے نام خط لکھا:

بہت عرصہ ہو گیا تم سے ملے ہوئے، اور ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر مصر آنے کی کوئی صورت بن پڑے تو کوشش کرو مصر آ جاؤ۔ جی چاہتا ہے کہ اخیر عمر میں تمہیں ایک دفعہ اور دیکھ لوں۔

امام احمدؒ نے جواب لکھا کہ

میں حاضر ہو رہا ہوں، دن اور تاریخ متعین کر دی کہ میں فلاں تاریخ کو حاضر ہو رہا ہوں

چناں چہ مقررہ وقت پر امام احمد بن حنبلؒ مصر کے لیے روانہ ہوئے اور اسی تاریخ کو مصر پہنچے جس کا وعدہ لکھا تھا۔ امام شافعیؒ استقبال کے لیے شہر سے باہر نکلے۔

جب امام نکلے تو جتنے علماء تھے سب کے سب امام شافعیؒ کے ساتھ چلے۔ علماء جب چلے تو جتنے حکام اور زعماء تھے وہ بھی ساتھ ہوئے۔ حتی کہ بادشاہِ وقت بھی استقبال کے لیے آ گیا۔

ایک بڑا عظیم جتھ گویا ملک کے اجلہ اورا کابر استقبال کے لیے آئے۔ اور پورے مصر میں خوشی تھی کہ آج امامِ وقت ہمارے ہاں مہمان ہورہے ہیں۔

امام شافعیؒ کی بچیوں کا یہ حال تھا کہ چھوٹی چھوٹی بچیاں کودتی پھرتی ہیں کہ ہمارے ہاں امامِ وقت مہمان ہونے والا ہے۔ خدا خدا کر کے امام احمدؒ پہنچے اور امام شافعیؒ کے ہاں قیام کیا۔

امام شافعیؒ نے کھانا لا کے رکھا۔ امام شافعیؒ کی مہمان نوازی مشہور اور تاریخی چیز ہے۔ ان کی مہمان نوازی کے عجائبات تاریخ کا حصہ ہیں۔ غرض امام شافعیؒ بہت شغف اور توجہ کے ساتھ مہمان نوازی کی اور کھانا لا کر رکھا۔

امام احمد بن حنبلؒ نے کھانا، کھانا شروع کیا، مگر اس طرح سے کھایا جس طرح کوئی سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے۔ اور کافی مقدار میں خوب پیٹ بھر کے کھایا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ معلوم نہیں کتنے وقت کا کھانا نہیں ملا۔

وہ زمانہ تقویٰ اور طہارت کا ہے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے گھر میں امام شافعیؒ پر اعتراض کیا کہ تم کہتے تھے یہ امامِ وقت ہے، یہ کیسا امامِ وقت ہے جو پیٹ بھر کے کھانا کھاتا ہے، یہ عوام الناس کا کام ہے کہ پیٹ بھر کے کھائیں۔ اتقیاء کا یہ کام نہیں ہے، وہ تو سنت کے تابع ہوتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ، صحابہؓ اور تابعین کی سنت یہ ہے کہ بقدر ضرورت کھالیا۔ لیکن اس طرح سے گر پڑ کے کھاکا کہ معلوم ہو کہ بہت وقت کا بھوکا ہے یہ شان اتقیاء کی نہیں ہے۔ تو یہ کیسا امامِ وقت ہے؟

امام شافعیؒ سے جواب نہیں بن پڑا۔ فرمایا کہ حیرت مجھے بھی ہے۔ مگر میں بول یوں نہیں سکتا کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میری زبان سے یہ نکلا کہ بھائی کم کھاؤ تو یہ موضع تہمت ہوگا کہ میں

شاید اپنی روٹی بچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے میری بولنے کا موقع نہیں مگر حیرت مجھے بھی ہے کہ احمد بن حنبلؒ میں یہ تغیر کیسے پیدا ہوا؟ کھانے کی طرف اس طرح متوجہ ہوئے؟

رعایتِ مقام

اتقیاء کے کھانے کی شان یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا کہ جب جہاد میں جاتے تھے تو یہ نہیں تھا کہ سامانِ رسد کے طور پر وہاں انڈے، کیک اور پیڑیاں پہنچتی تھیں۔ کچھ سوکھے ٹکڑے زنبیلوں میں بھرے ہوئے ہیں بہت بھوک لگی، چبا کر کھا لئے، کسی کے پاس وہ بھی نہیں کچھ کھجوریں پڑی ہوئی ہیں وہ کھالیں۔ یہ بھی نہ ہوا تو بعض کے پاس گٹھلیاں بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ گٹھلیاں منہ میں ڈال لیں گویا نفس کو بہلا دیا کہ ہم کچھ کھا رہے ہیں اور نفس سمجھ گیا کہ مجھے میری غذا مل گئی تو غذائیں یہ تھیں اور چوبیس گھنٹے جہاد میں مصروف تھے یہ روحانی ومعنوی قوت ہوتی تھی۔

حضرت قطب عالم شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ نے اپنے ملفوظات میں لکھا ہے کہ میں ایک ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے۔

اندازہ کیجئے ایک بادام بھی کوئی غذا ہے۔ شراح لکھتے ہیں کہ وہ خود حضرت شیخ ہیں۔ اپنے کو چھپانے کے لیے ایسے لکھا کہ میں کسی ایسے شخص سے واقف ہوں جو چالیس برس سے ایک بادام یومیہ پر افطار کرتا ہے۔

اور حالت یہ تھی کہ ان کے تراجم میں موجود ہے رات کو جب ذکر اللہ کرتے تھے تو اتنی بلند آواز سے ذکر کرتے تھے کہ سرائے میں ذکر کرتے تھے، دو فرلانگ پر شہر ہے ہر گھر میں اس طرح پر آواز پہنچتی تھی جیسے ہمارے دروازے پر بیٹھے ہوئے ذکر کر رہے ہیں۔ یہ ان کی قوت کی حالت تھی۔ یہ روحانی ومعنوی قوت تھی۔

اور نبی کریم ﷺ کے بارے میں حدیث فرمایا گیا ہے کہ دو دو مہینے ایسے گذرتے تھے کہ بیت نبوت میں دھواں بھی نہیں اٹھتا تھا۔ اسود ین پر گذر ہوتا تھا ایک کھجور کھالی، ایک کٹورا پانی پی لیا، یہ غذا ہوتی تھی۔ اور جب صوم وصال رکھنے پر آئے تو یہ بھی ختم ہو جاتی تھی۔

بہر حال انبیا علیہم السلام کی شان بھی کھانے پینے کے بارے میں انتہائی تقلیل کی ہے۔ صحابہ، اولیا اور اتقیاء کی شان بھی انتہائی قلت کی ہے۔ اتقیاء کی یہ نظیریں سامنے تھیں، ان کو سامنے رکھ کر لڑکیوں نے اعتراض کیا کہ احمد بن حنبلؒ کیسا متقی شخص ہے؟ اور کیسا امام ہے کہ جس نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا؟

امام شافعیؒ سے اس کا کوئی جواب نہیں بن پڑا، اور فرمایا کہ حیرت مجھے بھی ہے مگر میں میزبان ہونے کی وجہ سے بول نہیں سکتا۔ خیر وہ بات ختم ہوگئی۔

عشاء کا وقت آیا اور امام احمد بن حنبلؒ نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں تشریف لے گئے۔ تو امام شافعیؒ کی بچیوں نے امام احمدؒ کے لیے بستر کیا، اور لوٹا بھر کر پانی کا رکھا۔ تا کہ رات کو تہجد کے لیے اٹھیں تو تکلیف نہ ہو، لوٹا بھرا بھرایا مل جائے، رات کا یہ سب سامان کر کے بچیاں چلی گئیں۔

امام احمدؒ تشریف لائے چارپائی پر لیٹ گئے۔ صبح کی نماز کو جب اٹھ کر گئے۔ بچیاں بستر تہ کرنے آئیں تو معلوم ہوا لوٹا اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے اب تو ان کے غصہ کا پارہ انتہائی طور پر چڑھ گیا۔ اور انہوں نے امام شافعیؒ کا دامن پکڑ کے کہا کہ یہ تمہارے شاگرد جن کو تم کہتے تھے کہ امامِ وقت ہے اور اتقیاءِ امت میں سے ہیں تو یہ کیسا متقی ہے کہ پیٹ بھر کے یہ کھانا کھائے؟ اور رات کے اوقات میں نوافل پڑھنے کی اسے توفیق نہ ہو؟ تہجد یہ نہ پڑھے؟ یہ کیسا نئی قسم کا امام ہے؟ اب تو امام شافعیؒ سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ آخر احمد بن حنبلؒ کے استاد تھے تو بٹھلا کر کہا کہ

اے احمد بن حنبل! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا میں کل سے دیکھ رہا ہوں اور صبر کر رہا ہوں تم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا میں اس لیے نہیں بولا کہ میں میزبان تھا میرے اوپر تہمت آتی بہر حال میں نے صبر کیا۔ لیکن اب جب دیکھا کہ رات کو تہجد تک کی توفیق نہیں ہوئی، تو میرے سے نہ رہا گیا۔ تو تمہارے حالات میں یہ تغیر کب سے پیدا ہوا؟ یہ تو افسوس ناک حالات ہیں۔

امام احمد بن حنبلؒ ہنسے اور عرض کیا۔ حضرت! واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوئے ہیں۔

شانِ عمل اور شانِ اجتہاد

فرمایا کیا واقعہ ہے؟

کہا کہ واقعہ یہ ہے کہ آپ کو میرے زیادہ کھا کے کے اوپر اعتراض ہوا۔ حقیقتاً میں نے زیادہ کھایا ہے۔ اور کافی کھایا۔ عمر بھر میں کبھی اتنا نہیں کھایا تھا، جتنا یہاں کھایا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب آپ کا دستر خوان بچھا تو اتنی حلال کی کمائی تھی۔ اس کے اوپر آسمان سے انوار و برکات کی بارش تھی، میں نے عالم میں اتنی پاک کمائی نہیں دیکھی، میں نے ارادہ کیا جتنا زیادہ سے زیادہ کھا سکوں کھالوں ممکن ہے پھر ایسی پاک غذا مجھے نصیب نہ ہو۔ اس وجہ سے میں نے زیادہ کھایا چاہے مجھے سات دن روزے رکھنے پڑیں۔ مگر اتنا منور اور بابرکت لقمۂ حلال میں نے آج تک عالم میں نہیں دیکھا۔

اور فرمایا کہ اس کھانے کی دو برکتیں میرے اندر نمایاں ہوئیں ایک علمی اور ایک عملی۔ عملی برکت تو یہ نمایاں ہوئی کہ میں نے آج عشاء کے وضوء سے تہجد پڑھی اور صبح کی نماز بھی پڑھی یہ وجہ ہوئی لوٹا استعمال نہ کرنے کی۔ وہ بھرا ہوا رکھا رہ گیا۔ میں رات بھر عبادت میں رہا۔

اور علمی برکت یہ پیدا ہوئی کہ قرآن حکیم کی ایک آیت سے فقہ کے سو مسئلے نکالے، اور علوم کے دروازے مجھ پر کھل گئے۔ یہ لقمۂ حلال کی غذا کی برکت تھی۔

شرطِ معرفت

حقیقت یہ ہے کہ نورِ معرفت حلال غذا سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے کہ لقمہ حلال کا ہو۔ ایمانی وروحانی قوتیں لقمۂ حلال کے تابع ہیں۔

انسان کا پیٹ حوضِ بدن ہے۔ حوض میں جو بھرا جائے نلوں اور نالیوں میں بھی وہی آئے گا۔ اگر پیٹ میں پاک غذا ہے تو قلب میں پاک آثار آئیں گے اور دماغ میں بھی۔ اقوال بھی پاک نکلیں گے اور اگر لقمہ حلال نہیں ہے پھر وہی ظلمت اور کدورت ملے ہوئے اقوال وافعال ہوں گے۔ اور ایسی ہی حرکات بھی ہوں گی۔

اسی لیے اہل اللہ سب سے زیادہ لقمۂ حلال کا اہتمام کرتے تھے کہ ہماری کمائی پاک ہو۔ اس کمائی سے ہی قلب میں نورِ معرفت پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ قساوت پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں دیو بند میں ایک بزرگ تھے۔ شاہ جی عبداللہ صاحب ان کا نام تھا۔

بے پڑھے لکھے امی محض تھے مگر صاحبِ نسبت بزرگوں میں تھے انہوں نے اپنے گذر اوقات کے کا ذریعہ گھاس کھودنا مقرر کرلیا تھا۔ گھاس کھود کر گٹھری بیچتے تھے۔ اور گٹھری کی قیمت چھ پیسے مقرر کی ہوئی تھی۔ نہ ایک پیسہ کم لیتے تھے نہ ایک پیسہ زیادہ لیتے تھے۔

دیو بند میں جتنے لوگ اپنے جانوروں کے لیے گھاس خریدتے تھے، منڈی میں جب پہنچتے تو سینکڑوں گٹھریاں گھاس کی ہوتی تھیں۔ مگر سب منتظر رہتے تھے کہ ہم شاہ جی کی گٹھری خریدں گے ہر ایک اس کی کوشش میں ہوتا تھا اور سمجھتا تھا کہ ہمارا جانور ان کا لایا ہوا گھاس کھائے گا تو گھر میں برکت ہوگی۔

جب شاہ جی عبداللہ صاحبؒ نظر پڑتے تو لوگ ان کی طرف دوڑتے تھے بس جس نے جا کر پہلے ہاتھ لگایا۔ شاہ جی وہیں گٹھری ڈال دیتے تھے اور چھ پیسے لے لیتے تھے۔

اس چھ پیسے کی تقسیم ان کے ہاں کیا تھی؟

دو پیسے تو اسی وقت صدقہ کر دیتے۔ان دو پیسوں میں اس زمانے میں کچھ دھیلے کچھ پائیاں ملتی تھیں تو وہ ایک ایک دو دو بچوں کو، یتیموں کو، بیواؤں کو اور غریبوں کو وہیں کھڑے کھڑے تقسیم کر دیتے تھے۔اور دو پیسے روز ان کے گھر کا خرچ تھا۔ کچھ تیل لے لیا کچھ نمک کچھ لکڑی وغیرہ سستا زمانہ تھا تو دو پیسے روز میں گھر والوں کا خرچ ہو جاتا تھا۔

اور وہ دو پیسے جو بچتے تھے، انہیں جمع کیا کرتے تھے، سال بھر میں جب وہ چھ سات روپے بن جاتے تھے اس رقم سے ہمارے اکابر حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی دعوت کیا کرتے تھے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس ہیں، یہ فقط عالم ہی نہیں عارف باللہ بلکہ صاحب کشف وکرامت بزرگوں میں سے تھے۔ان کا مقولہ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا کہ سال بھر ہمیں شاہ جیؒ کی دعوت کا انتظار رہتا تھا کہ کب وہ دن آئے کہ ان کے گھر کا کھانا کھائیں اور فرمایا جس دن کھانا کھاتے تھے۔تو چالیس چالیس دن قلب میں نور رہتا تھا اور قلب میں جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ بھی عبادت کرلیں، نوافل پڑھ لیں، تلاوت کرلیں۔ ہر وقت طاعت وعبادت کا جی چاہتا تھا۔اس اکلِ حلال کی یہ برکت قلوب میں نمایا ہوتی تھی۔

سلبِ توفیق

لقمۂ حلال درحقیقت ایسی چیز ہے کہ اسی سے توفیق پیدا ہوتی ہے۔آج کی بے عملی لاعلمی کے سبب سے نہیں ہے۔علم تو عام ہوگیا۔ ہر شخص جانتا بوجھتا ہے۔ پھر بدعملی ہے؟ توفیق کے

سلب ہونے کی وجہ سے۔ اور توفیق لقمۂ حرام یا مشتبہ لقمہ کی وجہ سے سلب ہوتی ہے۔ اکلِ حلال پورا میسر نہیں ہے۔ بقول غالب کے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس لیے کہ مشتبہ غذاؤں نے طبیعت پر بندش عائد کر رکھی ہے۔ جس کی وجہ سے توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ غرض آج کے گناہوں کا سبب لاعلمی نہیں ہے۔ بلکہ طبیعت کی قساوت یا ظلمت یا عدمِ توفیق یا سلبِ توفیق یہ چیزیں باعث بنتی ہیں۔ اس لیے کہ لقمہ صحیح نہیں رہا۔

میں دیکھا کرتا ہوں، یہاں تو نہیں مگر ادھر اپنے نواح میں دیکھا۔ یہ جو آج کل شوگر مل ہر جگہ ہیں۔ ہمارے ہاں دیوبند سے لے کر دہلی تک ہر اسٹیشن پر ایک شوگر مل ہے۔ اس کی وجہ سے گنے کی کاشت بڑھ گئی۔ تو گنے ریل گاڑی اور بیل گاڑیوں میں بھر بھر کے جاتے ہیں۔ بعض مل والوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی ریلیں چلا رکھی ہیں تو وہ کھیتوں میں گھومتی ہیں اور وہاں سے گنا مل میں پہنچاتے ہیں تو مال گاڑی کے ڈبے ہر وقت بھرے ہوئے کھڑے رہتے ہیں۔ تو میں نے دیکھا کہ مسافر جب اترتے ہیں دیکھتے کہ مال گاڑی گنوں سے بھری کھڑی ہے تو کوئی بیس گنے کھینچ لایا، کوئی چالیس کوئی پچاس اور کھا رہے ہیں۔ میں حیرت سے دیکھا کرتا ہوں کہ یہ لوگ سمجھ کے کھا رہے ہیں کہ ان کے باپ کا مال ہے۔ انہیں کوئی احساس نہیں کہ یہ غیر کا مال ہے۔ ہمارے لیے اس کا کھانا حلال نہیں یا حرام ہے۔ کوئی حس باقی نہیں جیسے جانور، مثلاً بیل جس کھیت میں گھسا منہ مارتا ہوا چلا گیا، اسے اس کی کیا تمیز کہ میرے مالک کا کھیت ہے یا غیر کا۔ یہی حالت انسانوں کی ہوگئی کہ بس کھانے کی چیز سامنے آنی چاہیئے۔ پھر حلال ہو یا حرام۔ بے تحاشا اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ تو میں سوچا کرتا تھا۔ یا اللہ! ان کے قلوب کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس قسم کے مال سے سوائے قساوت، ظلمت اور تاریکی کے اور کیا پیدا ہوسکتا ہے۔ لقمۂ

حرام سے نیکی کا جذبہ نہیں ابھر سکتا۔ نیکی کا جذبہ ہمیشہ لقمۂ حلال سے ابھرے گا۔

پچھلے زمانے میں اہل اللہ جب بیعت کرتے تھے، پہلی شرط یہ لگاتے تھے کہ لقمۂ حلال بھی میسر ہے یا نہیں؟ اگر تمہاری غذا مشتبہ ہے تو سارا دن بھی ذکر اللہ کرو گے تو قلب کے اوپر آثار نمایاں نہیں ہوں گے۔ غرض لقمۂ حلال کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پاک کمائی سے نورِ معرفت پیدا ہوتا ہے اور پاک کمائی کی طرف جذبہ؟ یہ ظاہر بات ہے کہ اتباع انبیاء علیہم السلام سے ہی پیدا ہوسکتا ہے۔

لقمۂ حلال کی قرآن کریم میں جگہ جگہ تاکید کی گئی ہے۔ فرمایا: **ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل** ۔ایک دوسرے کا مال باطل کے ساتھ مت کھاؤ۔ حق کے ساتھ کھاؤ، جائز طریق پر کھاؤ، ناجائز طریق پر مت استعمال کرو۔

یہ چوری، ڈکیتی، رشوت، جُوا، سب اسی لیے تو ممنوع ہوئیں کہ یہ کمائیاں ناجائز ہیں۔ ان کے کھانے سے قلب پر بُرا اثر پڑے گا۔ مشتبہ کمائی سے بُرا اثر پڑے گا۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ میں مال کے مصارف کو دیکھ کر مداخل کا پتہ چلا لیتا ہوں، یعنی جن مواقع میں صرف ہوتا ہے۔ ان مواقع کو دیکھ کر پہچان لیتا ہوں کہ یہ مال کیسے مواقع سے آیا ہوگا۔ اگر پاک جگہ پر خرچ ہو رہا ہے۔ تو میں سمجھ لیتا ہوں کہ پاک طریق پر کمایا گیا ہے۔ اگر ناپاک مواقع پر صرف ہو رہا ہے میں سمجھ لیتا ہوں یقیناً ناجائز طریق پر کمایا گیا ہے پاک مال کبھی بھی ناپاک جگہ پر خرچ نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ ناپاک مال پاک جگہ پر نہیں لگ سکتا۔

☆☆☆

تصوف وسلوک ایک الہامی نظام

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

اللہ تعالی نے اس امت کو اجتماعی الہام کی دولت سے نوازا ہے، جو ہر قسم کے خطرہ اور ضرر اور انفرادی کمزوریوں اور غلط فہمیوں سے پاک اور محفوظ ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب اسلام اور مسلمانوں کے سامنے کوئی نازک اور اہم مسئلہ آتا ہے، اور اس کے بارے میں فیصلہ کرنا اور کسی نتیجہ پر پہونچنا مشکل ہوجاتا ہے، یا زمانہ کے تغیر اور حالات کے تقاضہ سے کوئی نئی ضرورت سامنے آتی ہے تو اللہ تعالی علماء اور مخلصین کے ایک معتد بہ گروہ کے دل میں جو نفس زکی اور ارادۂ قوی کے مالک ہوتے ہیں، اس ضرورت کی تکمیل کا شدت سے خیال پیدا کر دیتا ہے، اور ہمہ تن ان کو اس طرف اس طرح متوجہ کر دیتا ہے کہ وہ اپنے کو اس کام کے لیے مامور اور عنداللہ مسئول سمجھنے لگتے ہیں، ان کو اس کام کی تکمیل میں کھلے طور پر تائید الٰہی اور نصرت غیبی نظر آتی ہے، اور وہ دل کی گہرائی سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کی طرف کشاں کشاں لے جائے جارہے ہیں، یہ وہ حقیقت ہے، جس کو ہم نے ''اجتماعی الہام'' یا جماعتی ہدایت سے تعبیر کیا ہے، اور تاریخ اسلام اس کی مثالوں سے پر ہے۔

کبھی یہ الہام معدودے چند اصحاب کو ہوتا ہے، جیسا کہ اذان کے واقعہ میں عبداللہ بن زیدؓ اور حضرت عمر بن خطابؓ کے ساتھ پیش آیا کہ دونوں کے خواب یکساں نکلے، اور دونوں کو خواب میں کلمات اذان کی تلقین کی گئی، اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی تصویب فرمائی اور اذان کو شرعی حیثیت دے دی، جو آج تمام عالم اسلام میں رائج ہے، اور جیسا کہ لیلۃ القدر کے سلسلہ میں پیش ایا، جس کے بارے میں شیخین نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ''چند

صحابہ حضورﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے جنہیں خواب میں لیلۃ القدر کو رمضان کی اخیر سات راتوں میں دکھایا گیا تھا، تو رسول اللہﷺ نے فرمایا کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے خواب سات آخری راتوں کے بارے میں یکساں ہیں تو جو اسے تلاش کرنا چاہتا ہے، وہ انہیں سات راتوں میں تلاش کرے۔''

اوراسی کے قریب صلوۃ تراویح کا معاملہ ہے، جس کی اصل نبیﷺ سے ثابت ہے، جسے آپ نے تین دن کے بعد اس خیال سے چھوڑ دیا تھا کہ یہ امت پر فرض نہ ہو جائے اور اس طرح مشقت کا سبب نہ بن جائے، مسلمان اسے اکیلے اکیلے پڑھنے لگے، حضرت عمرؓ نے اس کی جماعت قائم کردی، حضرت عمر کا یہ فعل الہام الٰہی پر مبنی اور آسمانی رہنمائی کا نتیجہ تھا، اور اس میں بڑا ہی خیر پوشیدہ تھا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں اس نماز کو باجماعت ادا کرنے کا خیال اور اس میں ختم قرآن کا شوق پیدا کردیا، جو حفظ اور حفاظت قرآن کا بڑا ذریعہ ثابت ہوا، اور اس کی وجہ سے مسابقت اور رمضان کی راتوں میں بیدار رہنے کا داعیہ پیدا ہوگیا، اس سلسلہ میں اہل سنت جنہوں نے تراویح کو اپنایا اور ان جماعتوں کے درمیان جنہوں نے اس کا انکار کیا اس کھلے فرق کو دیکھا جاسکتا ہے، جو حفظ قرآن کی کثرت اور اس کے مطالعہ واہتمام کے سلسلہ میں پایا جاتا ہے۔

اور کبھی یہ الہام مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اور جم غفیر کو ہوتا ہے، جس کا کسی امر پر متفق یا کسی ضرورت کی طرف متوجہ ہونا محض اتفاقی واقعہ یا کسی سازش کا نتیجہ نہیں کہا جاسکتا، ان کی اس کوشش سے اسلام اور مسلمانوں کو نفع عظیم پہونچتا ہے، یا مسلمانوں کی زندگی کا کوئی خلا پر ہوتا ہے، یا کسی مہیب فتنہ، یا رخنہ کا سدّ باب ہوتا ہے، یا دین کے عظیم مقاصد میں سے کوئی مقصد پورا ہوتا ہے۔

اس طرح کے مبارک اجتماعی الہام کی مثال (جو بے شمار راسخ العلم علماء اور مخلصین وباعمل

لوگوں کو ہوا) حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں قرآن کو مصاحف میں جمع کرنا اور قرن اول وثانی اور اس کے بعد کی ابتدائی صدیوں میں حدیث کے جمع وتدین کا کام، مجتہدین کا استنباط، احکام اور جزئیات فقہ کی تفریع، علم نحو وقراءت، اصول فقہ اور قرآن اور اس کی زبان کو محفوظ کرنے والے تمام مفید علوم کی تدوین اور مدارس کی تعمیر، کتابوں کی نشر واشاعت وغیرہ اس اجتماعی الہام کی بہترین مثالیں ہیں، جن کے ذریعہ دین اور امت کی یہ اہم ترین ضرورتیں پوری کی گئیں، اور آنے والے خطرات کا سدِّ باب کیا گیا۔

اسی اجتماعی الہام کی ایک مثال گمراہ فرقوں، ملحدین ومتشککین، تعطل وبے عملی کی دعوت دینے والے فلسفوں اور تخریب پسند تحریکوں کی تردید وابطال کا کام بھی ہے، جس کے لیے مسلمانوں میں سے علم وذہانت، فکری صلاحیت اور ایمانی قوت میں امتیاز وتفوق رکھنے والے افراد میدان میں آئے، اور انہوں نے ان دعوتوں اور فلسفوں کو بے نقاب کر دیا، مسلمانوں کو ان کے برے اثرات سے بچالیا، یہ سب کارنامے الہان ربانی کا کرشمہ ہیں جس سے تاریخ اسلام کے ہر مرحلہ اور علم وتہذیب کے ہر مرکز میں مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت مشرف وسرفراز کی گئی، اور جو اس امت پر (جو آخری امت اور انسانیت کا مرکز امید ہے) خدا کی عنایت اور اللہ کے نزدیک اس کے بلندی مرتبہ کی دلیل ہے، اور یہ غیر منقطع الہام اور مسلسل عنایت اور اللہ کے نزدیک اس کے بلندی مرتبہ کی دلیل ہے، اور غیر منقطع الہام اور مسلسل مدد الٰہی، ختم نبوت اور محمد ﷺ کے بعد سلسلۂ وحی کے منقطع ہونے کی روشن دلیل ہے، جس کی اگلی امتوں میں کوئی واضح اور مسلسل نظیر نہیں ملتی، اس لیے کہ انہیں اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیوں کہ سلسلۂ نبوت قائم اور کار نبوت باقی تھا۔

تزکیۂ نفس وتہذیب اخلاق کا وسیع ومستحکم نظام جس نے بعد کی صدیوں میں ایک مستقل علم اور فن کی شکل اختیار کر لی، نفس وشیطان کے مکاید کی نشاندہی نفسانی اور اخلاقی بیماریوں کا علاج،

تعلق مع اللہ، اور نسبت باطنی کے حصول کے ذرائع وطرق کی تشریح وترتیب جس کی اصل حقیقت تزکیہ واحسان کے ماثور وشرعی الفاظ میں پہلے سے تھی، اور جس کا عرفی واصطلاحی نام بعد کی صدیوں میں ''تصوف'' پڑ گیا، اسی اجتماعی الہام کی ایک درخشاں مثال ہے، رفتہ رفتہ اس فن کو اس کے ماہرین نے اجتہاد کے درجہ تک پہونچا دیا، اور اس کو دین کی بڑی خدمت اور وقت کا جہاد قرار دیا، جس کے ذریعہ اللہ تعالی نے قلوب ونفوس کی مردہ کھیتیوں کو زندہ کیا، اور روح کے مریضوں کو شفا دی، ان مخلص علماء ربانیین اور ان کے تربیت یافتہ اشخاص کے ذریعہ دنیا کے دور دراز گوشوں اور طویل وعریض ممالک (جیسے ہندوستان، جزائر شرق الہند اور براعظم افریقہ) میں وسیع پیمانہ پر اسلام کی اشاعت ہوئی اور لاکھوں انسانوں نے ہدایت پائی، ان کی تربیت سے ایسے مردان کار پیدا ہوئے، جنہوں نے اپنے اپنے عہد میں مسلم معاشرہ میں ایمان ویقین اور عمل صالح کی روح پھونکی، اور بارہا میدان جہاد میں قائدانہ کردار ادا کیا، اس گروہ کی افادیت اور اس کی خدمات سے انکار یا تو وہ شخص کرے گا، جس کی تاریخ اسلام پر نظر نہیں، یا جس کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔

جیسا کہ حدیث متواتر کی تعریف اور اس کے قطعی الثبوت ہونے کی دلیل میں اہل اصول کہتے ہیں کہ ''اتنی بڑی تعداد نے ہر زمانہ میں اس کی روایت کی ہو کہ عقل سلیم اور انسانی عادات اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں کہ اتنے کثیر انسانوں نے غلط بیانی اور افتراء پردازی پر اتفاق کرلیا ہے، اور یہ کسی سازش کا نتیجہ ہے'' تاریخ کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرن ثانی سے لے کر اس وقت تک بلا انقطاع اور بلا استثناء ہر دور اور ہر ملک کے خدا کے کثیر التعداد مخلص بندوں نے اسی طریقہ کو اختیار کیا، اور اس کی دعوت دی، خود فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ پہونچایا، اور ساری زندگی اس کی اشاعت میں مشغول وسرگرم رہے، اور ان کو اس کی صحت وافادیت کے بارے میں پورا یقین واطمینان حاصل تھا، وہ اپنے ماحول ومعاشرہ

کا خلاصہ اور عطر تھے، اور نہ صرف اپنی راست بازی، خلوص و بے غرضی، پاک نفسی اور نیک باطنی میں، بلکہ کتاب وسنت کے علم، سنت کی محبت وعشق اور بدعات سے نفرت وکراہت میں بھی اپنے معاصرین میں فائق اور ممتاز تھے، ایک دو کا، یا دس پانچ کا کسی غلط فہمی یا سازش کا شکار ہو جانا ممکن ہے، اور بعید از قیاس نہیں لیکن لاکھوں انسانوں کا جو اپنے علم وعمل میں بھی امت کی صف اول میں نظر آتے ہیں، علی سبیل التواتر صدیوں تک اس غلط فہمی میں مبتلا رہنا، اس پر اصرار کرنا، اور اس کی دعوت دینا، اس پر پورے عزم واستقامت کے ساتھ قائم رہنا خلاف عقل اور خلاف عادت بات ہے، پھر ان کے انفاس قدسیہ سے لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہدایت یافتہ اور فیض یاب ہونا اور اعلیٰ باطنی روحانی کمالات تک پہونچنا خبر متواتر ہے، جس کا انکار ممکن نہیں، عقلاً وعادتاً یہ بات بالکل ناممکن معلوم ہوتی ہے کہ زمانی ومکانی اختلاف کے باوجود صادقین ومخلصین کا یہ گروہ عظیم متواتر ومسلسل طریقہ پر ایک غلط فہمی میں مبتلا رہا، اور اللہ تعالی نے بھی جو رحیم وحکیم اور ہادیٔ مطلق ہے، اور جس کا وعدہ ہے کہ:

والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا وان الله لمع المحسنین۔(العنکبوت۔۶۹)

اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں بڑے بڑے مجاہدے اور کوششیں کیں ہم ان کو ضرور بالضرور اپنے صحیح راستوں پر لگا دیں گے بے شک اللہ تعالی ہمت وصداقت کے ساتھ کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ان کی اس غلط فہمی کا پردہ چاک نہیں کیا، اور ان کی دستگیری نہیں فرمائی، آپ تاریخ اسلام میں سے ان صادقین ومخلصین کو جن میں ایک ایک آدمی اپنے عہد کا گل سرسبد، منارۂ نور اور نوع انسانی کے لیے شرف وعزت کا باعث ہے، نکال کر دیکھیں کہ ان کے بعد کیا رہ جاتا ہے، اور اگر ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تو پھر کون سی جماعت لائق اعتماد اور سرمایۂ افتخار ہوگی؟

☆☆☆

فقہ و فتاویٰ

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خان پوری دامت برکاتہم

مسجد سے متعلق بعض مسائل

سوال: ہم مسجد کا انتظام کرتے ہیں، لہذا بعض چھوٹے بڑے مسائل پیش آتے ہیں، جن کی طرف توجہ چاہتا ہوں۔

(۱) عامۃً نماز سے پانچ منٹ قبل اور پندرہ منٹ بعد پنکھے چالو رکھنے کا رواج تھا، تقریباً دس بارہ پنکھے تھے، فی الحال قدرے وسعت کے بعد مسجد میں چالیس سے زائد پنکھے ہیں۔ اگر کوئی شخص تلاوت، ذکر اور نوافل وغیرہ میں مشغول ہو، تو میں نے کمیٹی سے اجازت لے کر قدرِ ضرورت پنکھے چلانے کا حکم دیا ہے، اب لوگوں کی چاہت یہ ہے کہ جو شخص جہاں بھی کھڑا ہو، عبادت میں ہو، تلاوت میں ہو، وہاں پنکھا چلا دیا جائے۔ اگر مؤذن صاحب پنکھا نہیں چلاتے تو ان سے جھگڑا کر کے مجھ جیسے لوگوں سے شکایت کرتے ہیں۔ ''جھگڑے کا منہ کالا'' یہ سوچ کر کوئی شخص عبادت میں ہو تو بہ قدرِ ضرورت اس کو راحت پہنچائی جائے۔ اب سوال یہ ہے کہ مصلیوں کو کتنی راحت پہنچائی جائے؟ فرض نماز کے علاوہ نوافل، تلاوت یا ذکر کرتے وقت پنکھا چلانے کی اجازت دی جائے یا نہیں؟ متولی یا کمیٹی اس طرح کی اجازت دے سکتی ہے یا نہیں؟ مصلی یا اہلِ قریہ ایسے فائدے کا مطالبہ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

یہی سوال اس وقت بھی پیدا ہوتا ہے جب مسجد میں جماعت آتی ہے، انہیں پنکھے، لائٹ، گیزر اور کچن کی اشیاء کے استعمال کی اجازت ہے، البتہ ہر ساتھی الگ الگ پنکھا چلا کر سوتا ہے، تو بعض حضرات کو اعتراض ہے کہ یہ مسجد کے پیسوں کا غلط استعمال ہے۔ اب اگر اس سلسلے میں کمیٹی کوئی اصول طے کرے، یا مؤذن صاحب ٹوک دیں، تو تبلیغی جماعت کے ساتھی مؤذن اور

کمیٹی کو جماعت کے کام کا مخالف شمار کرتے ہیں۔اس سلسلے میں جماعت کے لیے کوئی اصول طے کئے جا سکتے ہیں یا نہیں؟

تیسری بات یہ ہے کہ رمضان میں سفراءاور مسافر آرام کے لیے مسجد کے پنکھے چلاتے ہیں، انہیں روک سکتے ہیں یا نہیں؟

چوتھا یہ کہ مسجد کے مصلی اور بعض اہل قریہ جس وقت جنریٹر چالو ہو،اس وقت کم وبیش پنکھے چلا کر مسجد کو اقتصادی نقصان پہنچاتے ہیں،تو انہیں روک سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال (۲): ہمارے پاس مسجد کی کچھ رقم رہتی ہے، اس رقم سے رمضان میں افطار یا تراویح کے وقت پانی میں برف ڈالنے کے لیے برف خرید سکتے ہیں یا نہیں؟

سوال (۳): ہم مؤذن کو کھانا دیتے ہیں،لیکن پکانے کا انتظام وہ خود کرتے ہیں۔ہم نے ایک کمرے میں چولہا رکھا ہے،اس پر وہ کھانا بناتے ہیں،اور جماعت کے ساتھی بھی اسی چولہے پر کھانا بناتے ہیں،تو گیس کے پیسے مسجد کی رقم سے دیے جا سکتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے کہ گاؤں کے کسی جماعت کے ساتھی نے اس کے پیسے نہیں دیے ہیں،حتی کہ پوچھا بھی نہیں کہ یہ پیسے کہاں سے آتے ہیں؟

سوال (۴): مسجد کے اندر ہی الگ مکان میں ایک مؤذن صاحب فیملی کے ساتھ رہتے ہیں، وہ اپنے اور اپنے اہل خانہ کے غسل کے لیے مسجد کا گیزر استعمال کرتے ہیں۔جب مجھے پتہ چلا تو میں نے انہیں روکا۔میرا سوال یہ ہے کہ مؤذن صاحب غسل کے لیے مسجد کا گیزر استعمال کر سکتے ہیں؟ دوسرے مؤذن صاحب مسجد کے صحن میں سوتے ہیں تو وہ مسجد کے پنکھے یا مسجد کا گیزر استعمال کر سکتے ہیں؟

سوال (۵): ہماری مسجد میں مسجد وار جماعت بیٹھتی ہے، اس میں میں بھی شریک ہوتا ہوں۔پہلے وہ صحن میں بیٹھتی تھی، پھر ذمہ داروں کی طرف سے یہ کہا گیا کہ آپ کو منبر کے پاس

ہی بیٹھنا چاہئے، صحن میں بیٹھنے سے لوگ دوسری جماعت سمجھیں گے، اور تعلیم بھی جماعت کے ساتھی ہی کریں۔ اب ہمارے یہاں سالہا سال سے مسجد کی تعلیم مولانا ہی کرتے ہیں، اگر ساتھی کریں گے تو عوام شک میں پڑ جائے گی، ہر ایک کو سمجھانا کافی دشوار امر ہے، لہذا تعلیم امام صاحب ہی کرتے ہیں۔ پھر دوسرے کونے میں جماعت کے ساتھی تعلیم کر کے ملاقات طے کرتے ہیں، البتہ جماعت کے ساتھی نئے، پرانے، جذباتی، سنجیدہ ہر قسم کے ہوتے ہیں، لہذا دین سے ہٹ کر بات چیت کا ہونا بھی ظاہر ہے۔ اور بعض مرتبہ بلند آواز سے باتیں ہوتی ہیں، جس کی وجہ سے جماعت خانے میں ذکر و تلاوت کرنے والوں کو خلل ہوتا ہے، تو وہ اعتراض کریں یا دل ہی دل میں گھٹتے رہیں؟ تو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے؟ بعض جماعت کے سنجیدہ حضرات کا کہنا ہے کہ ذمہ دار جو کہتے ہیں وہی ہونا چاہئے، چاہے کچھ بھی ہو جائے، چاہے جھگڑا ہی کرنا پڑے۔ دوسرے نرم مزاج لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اختلاف یا جھگڑا ہو ایسا کوئی کام ہمیں نہیں کرنا چاہئے۔ اب اس میں کمیٹی پریشان ہوتی ہے، اگر لوگوں سے کہا جائے تو وہ ناراض ہوں اور جماعت کے احباب سے کہیں تو کمیٹی پر مخالف کا لیبل لگتا ہے، ایسے دو تین تجربے ہو چکے ہیں۔ اور بہت سی مساجد اور گاؤں میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں، لہذا ہماری براہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔

سوال (٦): مسجد کی عمارت متزلزل تھی، دیمک سے خوب نقصان ہو چکا تھا۔ سالوں قبل مرمت کروائی تھی، لیکن مستعمل نہ ہونے کی بنا پر دوبارہ متزلزل ہو چکی ہے۔ مسجد کے پڑوس میں ہی مدرسہ ہے، جس میں کمروں کی ضرورت ہے، تو بڑے بچوں کو پڑھنے کے لیے مسجد کے منزلے پر بٹھا سکتے ہیں یا نہیں؟ مسجد کا اوپر کا حصہ مسجد کی حد ہی میں ہے۔

سوال (٦): مدرسہ ٹرسٹ چلاتا ہے، ٹرسٹ نے یہ اصول طے کیا ہے کہ آٹھویں کلاس تک کے بچے مدرسہ میں آسکتے ہیں، اور آتے بھی ہیں۔ لیکن اساتذہ کے سخت رویے اور سزا کی وجہ

سے ماں باپ بار بار شکایت کرتے ہیں، اور پریشانی ہوتی ہے۔ کمیٹی کی طرف سے ممانعت کے باوجود بعض پرانے اساتذہ اس کی خلاف ورزی کر کے اپنی من مانی کرتے ہوئے بچوں کو سخت سزا دیتے ہیں۔ ہم بچوں کو سمجھا بجھا کر مدرسے لاتے ہیں، اور اساتذہ اپنے نامناسب رویے سے ان کو بھگا دیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذمہ داری ناظمِ تعلیمات کے سر آتی ہے۔ تو بچوں کو اس طرح جسمانی سزا دینا یا نامناسب الفاظ استعمال کر کے ذلیل کرنا، اور شکایت کرنے والے والیوں کے ساتھ بدسلوکی کرنا، اور دل میں کینہ رکھ کر بچوں کے ساتھ پیش آنا اور کمیٹی کے حکم کی خلاف ورزی کر کے گاؤں میں جھگڑے کی فضا پیدا کرنا کس حد تک درست ہے؟ ایسے اساتذہ کے خلاف کمیٹی اقدام کر سکتی ہے یا نہیں؟ گاؤں کے اساتذہ اور بڑے ہونے کی وجہ سے ہم صبر کرتے ہیں، لیکن وہ اصلاح کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ آخر کار میں نے یہ طے کیا ہے کہ جھگڑا ہو، اس سے بہتر ہے کہ منصب چھوڑ دیا جائے، اس سلسلے کی رہنمائی فرمائیں۔

الجواب: حامداً و مصلیاً و مسلماً:

(۱) مسجد کی لائٹ اور پنکھے کے سلسلے میں شرعی حکم کی بنیاد رواج اور اصول پر ہے۔ یعنی اگر اصول یہ ہو کہ نماز سے پانچ منٹ قبل پنکھے چلا کر نماز کے بعد پندرہ منٹ تک چالو رکھے جاتے ہیں، تو اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔ البتہ اگر لائٹ اور پنکھا لگانے والے اور ان کا بل ادا کرنے والے کی جانب سے ہمیشہ استعمال کی اجازت ہو تو استعمال کر سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔ اسی طرح واقف کی طرف سے اجازت دی گئی ہو تب بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ یا اصول کے مطابق بقدرِ ضرورت استعمال کی اجازت ہو تب بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

ولا بأس بان يترك سراج المسجد فيه من المغرب الى وقت العشاء، ولايجوز ان يترك فيه كل الليل الا فى موضع جرت العادة فيه بذلك، كمسجد بيت المقدس ومسجد النبى ﷺ والمسجد الحرام او شرط

الواقف ترکه فی اللیل کما جرت العادة به فی زماننا. (البحر الرائق۵/ ۲۷۰، ۱۷۱)

موجودہ زمانے میں شہروں اور بڑے گاؤں اورآبادیوں میں جہاں مساجد میں مصلیوں کی دن رات آمد ورفت بکثرت ہوتی ہے، وہاں لائٹ اور پنکھے کے استعمال کے سلسلے میں عام اجازت دی جاتی ہے۔لہذا کمیٹی کی جانب سے تلاوت، ذکراورنوافل میں مشغول لوگوں کے لیے بقدرِضرورت پنکھے چلانے کا آرڈر دینادرست ہے،لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ نماز کے اوقات کےعلاوہ تلاوت کرنے والاایک شخص مسجد کےایک کونے میں بیٹھاہو،اوردوسرادوسرے کونے میں،اورتیسرا تیسرے کونے میں بیٹھ کرتلاوت کررہاہواور ہرایک اپنی اپنی سہولت کے مطابق پنکھا چلاکر بیٹھاہو،شرعاً اس کی اجازت نہیں ہے۔مسجد کی ہر چیز وقف ہے،اوراس کے استعمال کے لیے جواصول طے کیے گئے ہیں،ان پرعمل کرنا ضروری ہے۔اسی طرح اگر پنکھے چلانے کی اجازت دی جائےتو بجلی کے بل کا غیرضروری بوجھ آئے گا، جوناجائز ہے۔شریعت نے وضوتک میں شرعی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنے کوفضول گردان کرمنع فرمایاہے، چاہےنہرکے کنارے پر بیٹھ کروضوکررہاہو،اورتین مرتبہ سےزائددھوناشرعی حاجت سےزیادہ شمارکیاگیاہے،توپھراس طرح مسجد کے پنکھےاور لائٹ ضرورت سے زائداستعمال کرنے کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟

یہی حکم جماعت کابھی ہے،لہذااس سلسلے میں کوئی اصول طے کرکےاس کےمطابق ہرشخص عمل کرے،یہ توکمیٹی کافریضہ ہے،جواسےاداکرناچاہئے۔محض اسی وجہ سےان پرتبلیغی جماعت کےمخالف ہونے کاالزام لگانادرست نہیں۔

شریعت نے مسافرکومسجد میں سونے کی اجازت دی ہے،لہذاانہیں بھی بقدرِضرورت استعمال کی اجازت دی جاسکتی ہے،اورغیرضروری استعمال سےروکاجاسکتاہے۔

جنریٹر اور انویٹر کی ایک خاص حد ہوتی ہے، اس سے زیادہ بوجھ ڈالنے کی صورت میں کافی نقصان ہوتا ہے، لہذا مصلیوں اور اہلِ قریہ کو چاہئے کہ جب جنریٹر اور انویٹر سے پنکھے چلائے جائیں، تب زائد پنکھے چلا کر مسجد کو اقتصادی نقصان سے بچانا ضروری ہے، اگر کوئی اس کے خلاف کرتا ہے تو کمیٹی اسے سختی سے روک سکتی ہے۔ اس سلسلے میں اصول وضوابط طے کر کے ہر شخص ان پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔

(۲) مسجد کے انتظام کے پیسوں میں سے نہیں خرید سکتے، البتہ اگر پانی کے انتظام کے لیے کسی نے رقم دی ہو، یا اس سلسلے میں خرچ کرنے کے لیے کسی ذریعۂ آمدنی سے آمدنی جاری ہو، تو اس کام میں استعمال کر سکتے ہیں۔

(۳) اس کا حکم بھی حسب سابق ہے۔

(۴) اس کی بنیاد بھی اصول وقوانین پر ہے، اور اصول یہ ہے کہ فیملی کے ساتھ رہنے والا مؤذن استعمال نہیں کر سکتا، تنہا رہنے والا مؤذن استعمال کر سکتا ہے۔

(۵) مسجد میں کوئی شخص نماز یا تسبیح وغیرہ میں مشغول ہو، اس وقت مسجد میں جہراً قرآن پڑھنا اور ذکر کرنا جائز نہیں۔ (آداب المساجد/ ۳۸) تو پھر صورت مسئولہ کے مطابق دنیوی بات چیت کر کے شور وغل کے ذریعے تلاوت تسبیح وغیرہ میں مشغول لوگوں کو خلل پہنچانا کیسے درست ہوسکتا ہے؟ اس سلسلے میں شریعت کے حکم کو مدنظر رکھتے ہوئے قدم اٹھانا چاہئے۔

(۶) مسجد کے اوپری منزلہ بھی مسجد ہی کے حکم میں ہے، محنتانہ لے کر مسجد میں پڑھانا جائز نہیں، لہذا مسجد کے اوپری منزلے پر بچوں کو پڑھنے کے لیے نہیں بٹھا سکتے، البتہ اگر پڑھانے والا شخص محنتانہ نہ لیتا ہو، اور لڑکے بڑے ہونے کی وجہ سے مسجد کا ادب واحترام باقی رکھتے ہوں، تو پڑھنے کے لیے بٹھا سکتے ہیں۔

(۷) بچوں کی اولیاء کی اجازت سے بہ ضرورتِ تعلیم مارنا، سزا دینا شرعاً درست ہے، مگر

بچوں کے تحمل سے زائد نہیں۔لکڑی وغیرہ سے نہیں، بلکہ صرف ہاتھ سے، وہ بھی ان کے تحمل کے موافق تین چپت تک مار سکتا ہے، وہ بھی سر اور چہرے کو چھوڑ کر، یعنی گردن اور کمر پر، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں، ورنہ بچے قیامت میں قصاص لیں گے۔ بچوں پر نرمی اور شفقت کی جائے۔اب پیٹنے کا دور تقریباً ختم ہو گیا،اس کے اثرات اچھے نہیں ہوتے۔(فتاویٰ محمودیہ کراچی ۱۴/ ۱۲۷، ۱۲۹ سے ماخوذ)

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ لکڑی یا کوڑے یا جوتے وغیرہ سے مارنے کی اجازت نہیں۔ (۱۴/ ۱۲۸)

اسی طرح بچوں کو نامناسب الفاظ استعمال کر کے ذلیل کرنا بھی جائز نہیں۔ نیز مدرسین کی اس غلطی پر اولیا کے شکایت کرنے کی صورت میں ان کے ساتھ نامناسب سلوک کرنا اور دل میں کینہ رکھ کر بچوں سے بدسلوکی کرنا تو کسی حال میں جائز نہیں۔لہٰذا کمیٹی کو چاہئے کہ اس سلسلے کے اصول وقوانین طے کر کے ان پر عمل کرنے کی مدرسین کو تاکید کرے، اور ان کی خلاف ورزی کی صورت میں ایک دو مرتبہ نرمی سے سمجھائے اور عمل کرنے کی تاکید کرے، نہ ماننے کی صورت میں آگے اقدام بھی کیا جا سکتا ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ أعلم

☆☆☆

انسان کا اجتماعی مزاج

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

معاشرہ کی افادیت

جن افراد سے معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے وہ اپنے افکار وجذبات میں ایک طرح کا اشتراکِ وحدت رکھتے ہیں۔ دراصل نفسیات کی اصطلاح میں معاشرہ یا سماج کا اطلاق ہمیشہ انہی انسانی مجموعوں پر ہوتا ہے جن میں ناموسِ وحدت فکری مع اپنے دیگر فروع ولوازم کے موثر اور عامل ہو۔ معاشرہ یا سماج کے سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ معاشرہ بننے پر اس کے افراد کے مجموعے میں عقلی قوتِ عمل کمزور پڑ جاتی ہے اور احساسات زیادہ فعال ہوجاتے ہیں اور اس طرح پر ان میں تغیر عظیم ہوجاتا ہے۔ اور اس طرح افراد کا یہ مجموعہ ایک وحدت بن جاتا ہے۔ اس کا مزاج، اخلاق اور معتقدات مستقل الگ رنگ ومعیار کے حامل بن جاتے ہیں۔

معاشرہ کی افادیت کئی طرح کی ہے ایک تو یہ ہے کہ وہ فرد کے کام کو آسان بنادیتا ہے کیوں کہ انسان اپنی خصوصیات وکیفیات کے لحاظ سے تن تنہا اچھی زندگی نہیں گزار سکتا اس کو دوسرے انسان کی مدد وتعاون کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ اجتماعی زندگی کی صورت میں یہی ہوسکتا ہے۔

اجتماعی وحدت یعنی معاشرہ کی دوسری افادیت یہ ہے کہ اس کی زندگی میں افراد کی طاقت وقوت میں بے اندازہ اضافہ ہوجاتا ہے اور جو کام متفرق طریقہ سے افراد علیحدہ علیحدہ نہیں انجام دے سکتے وہ اجتماعی زندگی کے ذریعہ سبھوں سے انجام پاجاتا ہے۔ اجتماعی وحدت ایک ایسی طاقت وقوت ہوتی ہے جو افراد کے متفرق طریقہ سے برسرعمل ہونے سے حاصل نہیں ہوسکتی دفاع اور حفاظت کا کام بھی اجتماعی وحدت سے جس طرح ہوسکتا ہے، افراد کے علیحدہ علیحدہ

انتظام سے نہیں ہوسکتا۔

معاشرہ یعنی اجتماعی وحدت کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ فرد کے کام ومقام کو متعین کرتا ہے، ہر فرد اپنی سہولت وصلاحیت کے مطابق محدود دائرے میں کام کرتے ہوئے مجموعی دائرہ کے فوائد حاصل کرتا ہے ہر شخص کا کام اور مقام متعین ہوتا ہے، لیکن تمام افراد کے مجموعے کی جدوجہد سے حاصل ہونے والے نتائج میں شریک ہوتا ہے، اور ایک یا چند پہلوؤں پر توجہ مرکوز رکھ کر تمام پہلوؤں کے فوائد میں حصہ دار بنتا ہے۔ یہ بات اجتماعی وحدت کے تعاونی مزاج اور تقسیم عمل سے حاصل ہوتی ہے۔

انسانی مزاج کی پختگی اور تغیر پذیری

انسانی مزاج وفطرت اپنی پختگی کے لحاظ سے دوطرح کا حال رکھتی ہے ایک تو نا قابلِ تغیر دوسرا قابلِ تغیر۔

قرآن مجید میں آیا ہے: فطرة الله التی فطر الناس علیها لاتبدیل لخلق الله۔ ''اللہ کی بنائی ہوئی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کی سرشت قائم کی ہے اللہ کی پیدا کی ہوئی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں۔''

لیکن دوسری جگہ فرمایا کہ **ان الله لایغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسهم۔** ''اللہ تعالی اس حالت کو جو کسی قوم کی ہوتی ہے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدل دے۔''

اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''**کل مولود یولد علی الفطرة فابواه یهودانه وینصرانه ویمجسانه**'' ہر پیدا ہونے والا فطرت پر ہی پیدا ہوتا ہے اس کے بعد اس کے والدین اس کو یہودی بناتے ہیں، عیسائی بناتے ہیں، مجوسی بناتے ہیں۔

ان حوالوں سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی جو فطرت بنادی گئی ہے وہ بالکل نہیں بدلتی خود حضور محمد ﷺ نے فرمایا کہ تم ایک پہاڑ کو سنو کہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تو تسلیم کر سکتے

ہو لیکن اگر یہ سنو کہ کوئی اپنی فطرت سے ہٹ گیا تو تسلیم کرنے کی بات نہیں۔ یہ فطرت وہ حالت ہے کہ اس کو بدلا نہیں جا سکتا۔ کسی وقت یہ مزاج دب سکتا ہے، خاص حالات کے اثر سے مغلوب ہو سکتا ہے لیکن بدل نہیں سکتا۔ ایسے مزاج کو بدلنا بے نتیجہ محنت کرنا ہے۔ عورت کے اسی مزاج کے بارے میں فرمایا کہ عورت دراصل پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خمیدہ ہے، یہ مزاج عورت میں ہے تم اگر اس خمیدہ کو بصورت مستقیم کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ سکتی ہے بصورت مستقیم نہیں ہو سکتی۔

لیکن انسان کا دوسرا مزاج بہت سے اثرات یا حکیمانہ کوشش سے بدلا جا سکتا ہے۔ تربیت و تعلیم کا میدان عمل بھی اصلاً یہی مزاج وطبیعت ہوتی ہے اور تعلیم و تربیت کی ساری کوشش اسی طبیعت کی اصلاح یا افساد کے لیے صرف کی جاتی ہیں۔ یہ بات افراد کے ساتھ بھی ہے اور افراد کے مجموعے کے ساتھ بھی۔

اجتماعی مزاج عقلی سے زیادہ جذباتی

افراد کے معاملہ میں تو فرد واحد کو دیکھنا پڑتا ہے لیکن اجتماعیت کی صورت میں افراد کے انفرادی مزاجوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ افراد کی اجتماعی زندگی سے جو مشترک مزاج پیدا ہو جاتا ہے اس کو سامنے رکھا جاتا ہے اور وہ علیحدہ رنگ اور سطح کا ہوتا ہے۔ اس میں عقلی عمل کمزور اور احساسات کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ سطحیت اور جذباتیت کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ اجتماعی وحدت کے مزاج میں ایک نیم شعوری کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس میں عقل اپنی تاثیر کو زیادہ برقرار نہیں رکھ پاتی۔ عقلی استدلال سے اثر نہیں پڑتا جو شعوری تحریک یا جذباتی انداز سے پڑتا ہے۔ عجیب وغریب بات کا اثر اس سے کہیں زیادہ ہوتا جتنا سیدھی سادھی اور معقول و عام بات کا ہوتا ہے۔

معاشرہ کی اپنے معتقدات کے ساتھ وابستگی

اجتماعیت میں ایک خاص مزاجی کیفیت یہ بھی ہوتا ہے کہ اپنے معتقدات پر زیادہ طاقت سے قائم رہتی ہے اور ان میں تبدیلی آسانی سے قبول نہیں کرتی اور ہر ایسی کوشش کو علی العموم طاقت کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے۔ اسی لیے عام طور پر مصلحین وانبیاء کی دعوت کو بڑا مقابلہ وجہاد کرنا پڑتا ہے اور طویل محنتوں اور صبر وبرداشت کے بعد جستہ جستہ کامیابی ملی ہے۔ ہمیشہ نئی بات خواہ وہ کیسی ہی قرینِ عقل اور قابلِ قبول رہی ہو یہ کہہ کر مسترد کردی جاتی ہے کہ ماالفینا علی آباءنا یعنی جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے یہ اس کے خلاف ہے۔ حتی کہ اللہ تعالی نے فرمایا کہ **وان کا آباء ھم لایعقلون شیئا ولایھتدون** ۔ یعنی کیا اس وقت بھی ایسا کریں گے کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ راہ پاتے ہوں۔

جماعت کا مزاج یہ ہے کہ یوں تو نئی بات کو مشکل سے قبول کرتی ہے لیکن اگر کسی وجہ سے قبول کرتی ہے تو اس کو حتی الوسع اپنے مخصوص رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہے اور اس کو اپنے طرز کا بنالیتی ہے۔

انفرادی منفعتوں کی کمزوری

جماعت کی وحدت میں افراد کی علیحدہ علیحدہ منفعتوں کا جذبہ کمزور ہوجاتا ہے۔ ہر مسئلہ میں جماعتی نقطہ نظر سے معاملہ ہوتا ہے۔ جماعت کا ایک مخصوص مزاج بن جاتا ہے طبیعت کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے لیکن اس میں وہ مشترک حالات کو جماعت کا بنیادی مزاج ہوتے ہیں، حسبِ ذیل ہیں:

تخیل کا اثر

(ا) ضعیف العقلی، تخیل آرائی، مبالغہ پسندی، یعنی جماعت کی صورت اختیار کرلینے کے بعد عقل کی بنیاد کمزور ہوجاتی ہے، ایک نیم شعوری کیفیت کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ خیالات کا عمل دخل زیادہ

ہوتا ہے اور جماعت کی طبیعت میں مبالغہ پسندی پیدا ہوجاتی ہے، تمام حالات ومسائل میں اس کی مذکورہ بالا صفات ابھر آیا کرتی ہیں۔اس میں زوداعتقادی، خیالی باتوں سے تعلق اوران کا اثر قبول کرنے کی صفت بڑھی ہوئی ہے وہ وہمی باتوں سے وہ اثر لیتی ہے جو حقیقی باتوں سے نہیں لیتی۔

جذباتیت

(۲) دوسری خاص صفت جذبات کے غالب رہنے اور اشتعال پذیر ہونے کی ہے، جماعت جذبات سے زیادہ کام لیتی ہے اور جذبات میں تحریک پیدا کرنے والی باتوں سے اور زیادہ مشتعل ہوجاتی ہے اس میں تعصب اور قدامت پرستی کا مزاج ہوتا ہے۔صاحبِ طاقت وسطوت سے مرعوبیت ہوتی ہے اس کے سامنے جھکتی ہے اوراس کی باتوں کو بسروچشم قبول کرتی ہے جوافراد جماعت کی اس کمزوری کو جانتے ہیں وہ بعض غلط یا معمولی نکتوں سے جماعت کو متاثر اور متحرک کردیتے ہیں اوراس کی اشتعال پذیری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

تلون مزاجی

(۳) جماعت کی تیسری صفت تلون مزاجی ہے وہ ایک معاملہ یاایک رائے پر زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی، اس کے جذبات کو قائم رکھنے کے لیے قائد کو جدت اختیار کرتے رہنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

اخلاقی معیار کی کمی

(۴) جماعت کی چوتھی صفت اخلاقی معیار کی پستی ہے، اس سے اخلاقی سطح کی امید نہیں کی جاسکتی جو فرد سے کی جاسکتی ہے۔اس سلسلہ میں اس کا معیار علی العموم کمزور ہوتا ہے بلکہ اخلاقی ابتذال اس کے مزاج کا جز ہوتا ہے اور جماعتی رجحان اسی کی طرف مائل ہوجایا کرتا ہے۔

☆☆☆

عظمتِ قرآن

حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی

قرآن مجید کا پہلا حق اس پر ایمان لانا ہے اور دوسرا حق اس کی عظمت کا ہے کہ اس کی بڑائی دل میں ہو، یہ بڑائی ہر حیثیت سے ضروری ہے، بڑائی ظاہر میں بھی ہو اور باطن میں بھی، ظاہر میں بڑائی وعظمت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ادب سے رکھا جائے، سب سے بلند جگہ پر رکھا جائے، اس کی صفائی ستھرائی کا اہتمام رکھا جائے، آج کل تو مسجدوں میں قرآن مجید کثرت سے ہوتے ہیں، ان پر گرد ہوتی اور وہ بے ترتیبی سے رکھے رہتے ہیں، یہ خلافِ ادب ہے۔ اللہ کے کلام کا ادب یہ ہے کہ اس کو سلیقہ سے رکھا جائے، اس کی تعظیم کی جائے اور یہ تعظیم حقیقت میں ہمیں سکھائی گئی ہے، ایسا نہیں کہ بس یوں ہی کوئی رائے قائم کر لی گئی اور اس پر عمل ہو رہا ہو، ارشادِ الٰہی ہے:

ومن یعظم شعائر الله فانها من تقوی القلوب (الحج:۳۲) اور جس نے شعائر اللہ کی تعظیم کی تو یقیناً یہ دل کے تقویٰ کی بات ہے۔

شعائر اللہ میں اس وقت روئے زمین پر سب سے بڑی چیز اللہ کا کلام ہے، میں نے بہت سے ملکوں میں دیکھا کہ پیر پر قرآن مجید رکھ کر پڑھ رہے ہیں، یا زمین پر قرآن مجید کی جانب ہی پیر پھیلائے ہوئے ہیں اور وہ اس بات کو غلط بھی نہیں سمجھتے بلکہ کہتے ہیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جب کہ خود انسانی نفسیات میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ادب واحترام کو پسند کرتا ہے۔

ایک مرتبہ مسجد مسجد نبوی میں لطیفہ ہوا، کچھ نوجوان قرآن مجید کی طرف پاؤں کئے ہوئے لیٹے تھے اور باتیں کر رہے تھے، ہمارے ایک بہت محترم عزیز جناب طارق حسن عسکری صاحب وہیں بیٹھے ہوئے تھے، وہ بڑے دلچسپ آدمی تھے، انہوں نے سوچا کہ اگر ان کو جا کر ٹوکا تو شاید

بات ان کی سمجھ میں نہ آئے، اس لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ ان کے بالکل قریب گئے اور اپنے پیر ان لڑکوں کے منھ کی طرف کرکے لیٹ گئے، جب ان لڑکوں نے دیکھا تو ناگواری کا اظہار کیا، تب مولانا نے کہا کہ تمھیں اپنے منھ کی طرف میرا پیر کرنا برا لگ رہا ہے، پھر تمھیں یہ کیسے گوارا ہو گیا کہ تم قرآن مجید کی طرف پیر کئے ہوئے بے فکری کے ساتھ لیٹے ہو اور باتوں میں مست ہو، اس سے ان کو بات سمجھ میں آ گئی اور انہوں نے فوراً اپنے پیر سمیٹ لیے، اگر یہ بات زبان سے کہی جاتی تو شاید سمجھ میں نہ آتی۔

توقیر و تعظیم اور ادب واحترام ایک نفسیاتی چیز ہے، حیرت کی بات ہے کہ آدمی اپنے لیے اس کو پسند کرے، مگر اللہ کے کلام کے لیے اس کا خیال نہ رہے، یہ ایک طرح کی محرومی کی بات ہے۔ شعائر اللہ کی بے توقیری اچھی چیز نہیں ہے، اس سے اللہ کے یہاں محرومی لکھ جاتی ہے، اس لیے قرآن مجید کا ظاہری ادب واحترام بھی ضروری ہے کہ اس کو عظمت سے رکھا جائے، اگر تلاوت کرے تو زمین پر نہ رکھے بلکہ کسی اونچی چیز پر رکھ کر کرے، بہتر ہے کہ اس کی طرف پشت نہ کرے، غرض کہ اداب واحترام کی جو شکلیں بھی ممکن ہیں وہ کی جائیں۔

یہ بات بھی قرآن مجید کی بے توقیری میں شامل ہے کہ جب قرآن مجید کے نسخے پرانے ہو جاتے ہیں اور اس کے اوراق پھٹنے لگتے ہیں تو وہ کبھی کبھی مسجدوں میں یوں ہی ادھر ادھر پڑے ہوئے نظر آتے ہیں، ظاہر ہے یہ بھی خطرناک چیز ہے، یہاں تک کہ بعض مرتبہ سڑکوں، گندی اور نامناسب جگہوں پر قرآن مجید کے اوراق بعض مرتبہ نظر آتے ہیں، یہ بہت بے ادبی اور آخری درجہ کی بات ہے، اس کا اہتمام ہونا چاہئے کہ اگر قرآن مجید بوسیدہ ہو جائیں تو ان کو کہیں ادب سے ایسا کر دیا جائے کہ اس کی بے توقیری نہ ہو، علماء نے اس کی مختلف شکلیں بتائی ہیں، اسی لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ اگر کہیں قرآن مجید کے اوراق نظر آئیں۔قرآن مجید تو بہر حال بہت اونچی چیز ہے۔اگر قرآن مجید کے الفاظ وحروف بھی کہیں نظر آ جائیں یا اس زبان کی کوئی اور تحریر

بھی نظر آجائے تو بہتر ہے کہ توقیر قرآن کے نتیجہ میں اس کو بھی ادب سے اٹھا کر کہیں پر ایسا کر دیا جائے کہ نسبت قرآنی کی وجہ سے بے توقیری نہ ہو، قرآن نہ ہو بلکہ اگر کوئی دینی کتاب ہو تو اس میں آیات ہوسکتی ہیں، یا اس میں الفاظ قرآن ہوسکتے ہیں تو اس کی بھی توقیر ہونی چاہئے۔

قرآن مجید کی باطنی توقیر بھی ضروری ہے اور باطنی توقیر یہ ہے کہ اس کی عظمت و محبت دل میں ایسی جاگزیں ہو جائے کہ جب بھی حکم قرآن سامنے آئے تو ساری خواہشات دب جائیں، جب اللہ کا حکم آ گیا اور قرآن مجید کی آیت پڑھ کر سنائی گی تو اب اس کے بعد ہماری خواہش ہماری رسم اور ہمارے ارادے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، قرآن مجید میں صاف ارشاد ہے:

یا ایھا الذین آمنوا لاتقدموا بین یدی الله ورسوله واتقوا الله ان الله سمیع علیم۔(الحجرات:۱)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت ہوا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلاشبہ اللہ خوب سنتا، خوب جانتا ہے۔

جب اللہ اور اس کے رسول کا حکم آ گیا، اس کے بعد آدمی اس حکم سے دائیں بائیں ہو اور اپنی رائے چلائے تو یہ بڑی بے توقیری کی بات ہے اور اللہ کے حکموں کی پامالی ہے، اس لیے یہ بھی توقیر اور قرآن مجید کی عظمت کا حصہ ہے کہ اس کو بلند رکھا جائے، ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی یعنی اس کے حکموں کو بلند رکھا جائے اور اس کی محبت تمام کتابوں سے زیادہ ہو۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی پڑھتے پڑھتے تھک جاتا ہے اور طبیعت اکتاتی ہے تو چاہئے کہ اسے رکھ دے پھر جب جی چاہے تو پڑھے، اگر یہ خیال اس کے اندر پیدا ہو جائے کہ یہ میرے رب کا کلام ہے تو شاید پڑھنے میں لطف آجائے اور مزہ آنے لگے، کتنے اللہ کے بندوں میں دیکھا گیا جو قرآن مجید نہیں پڑھ پاتے مگر وہ قرآن مجید کھول کر بیٹھ جاتے تھے اور ہر ہر سطر پر انگلی پھراتے ہوئے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھتے رہتے تھے، بعضوں کے بارے میں سنا کہ وہ ہر ہر سطر پر انگلی

پھیرتے جاتے اور'' هذا كلام ربی ''(یہ میرے رب کا کلام ہے) پڑھتے رہتے تھے۔

اگر دل کے اندر عظمت و محبت پیدا ہو تو عمل کرنے میں سہولت ہوتی ہے، اگر اللہ کا کلام اور اس کا حکم سامنے آ جائے تو یہ کیسے ہوگا کہ آدمی اس کو پیچھے ڈال دے، اس کا ادب یہ ہے کہ آدمی اس کو ظاہراً بھی پیچھے نہ ڈالے اور حقیقت میں بھی پیچھے نہ ڈالے، قرآن مجید میں ان لوگوں کے متعلق یہ بات کہی گئی ہے جو اس کو پس پشت ڈال دیتے ہیں کہ وہ کیسا نامناسب کام کرتے ہیں، قرآن مجید میں ان کے لیے لیے سخت کلمات اختیار کئے گے ہیں:

واذ اخذ الله ميثاق الذين اوتوا الكتاب لتبيننه للناس ولاتكتمونه فنبذوه وراء ظهورهم واشتروا به ثمنا قليلا فبئس مايشترون. (آل عمران:۱۸۷)

اور جب اللہ نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گی یہ عہد لیا تھا کہ تم اس کو ضرور لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کردوگے اور اس کو چھپاؤگے نہیں تو انہوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے عوض تھوڑے دام مول لیے تو کیسا بدترین سوداوہ کر رہے ہیں۔

یہ پس پشت ڈالنا ظاہر میں بھی مناسب نہیں لیکن اصل یہ ہے کہ باطن میں یعنی اس کے کسی حکم کو پس پشت ڈال دیا جائے، اس کا اہتمام نہ کیا جائے اور اس میں اپنی رائے چلائی جائے، یہ انتہائی خطرناک بات ہے۔

☆☆☆

قسط آخر

حکمِ خدا کی اہمیت

پیر ذوالفقار احمد نقشبندی

ایاز کے دل میں حکمِ شاہی کی قدر

سلطان محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑا نیک مسلمان بادشاہ گزرا ہے۔اس کے پاس ایک غلام تھا جس کا نام ''ایاز'' تھا۔ وہ ایک دیہاتی آدمی تھا لیکن جب وہ بادشاہ کے پاس آیا تو ایک اچھا خدمت گار ثابت ہوا۔ بادشاہ کو اس کی خدمت پسند آ گئی۔اسی لیے بادشاہ نے اسے اپنے مقربین میں شامل فرمالیا۔

اب دوسرے مصاحبین کے دلوں میں حسد پیدا ہوا کہ اس کی اتنی عزت افزائی کیوں ہوتی ہے۔ جی ہاں، جہاں فضل وکمال ہوتا ہے وہاں حاسدین بھی پیدا ہوجاتے ہیں۔ اب وہ حاسدین آپس میں مشورہ کرتے رہتے کہ ہم اس کو کیسے بادشاہ کی نظر سے گرائیں تاکہ یہ یہاں سے دفع دور ہو جائے۔ چناں چہ وہ موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔

حسد کی آنکھیں نہیں ہوتیں مگر اس کے کان بہت بڑے ہوتے ہیں اس لیے حاسدین چھوٹی چھوٹی باتیں سن سنا کر ان کا بتنگڑ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک دن ان لوگوں نے مل کر بادشاہ سے کہا کہ بادشاہ سلامت! ہم آپ کے مقرب ہیں، پڑھے لکھے ہیں، خاندانی لوگ ہیں اور امراء بھی ہیں لیکن آپ کی محبت کی جو نظر ایاز پر ہے وہ اور کسی پر نہیں ہے۔ بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے، میں آپ کو کبھی اس کا جواب دوں گا۔

ایک دن بادشاہ نے ایک پھل منگوایا جو بہت ہی کڑوا تھا۔اس نے اس کی قاشیں بنوائیں اور ایک ایک قاش اپنے مصاحبین میں تقسیم کروا دی۔ایک قاش ایاز کو بھی دی۔اب جس نے وہ

پھل کھایا اسے بہت ہی کڑوا لگا۔ ہر ایک نے کہا کہ بادشاہ سلامت! یہ پھل تو بہت ہی کڑوا ہے۔ لیکن جب بادشاہ نے ایاز کو دیکھا تو وہ مزے سے پھل کھا رہا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا: ایاز! آپ کو پھل کڑوا نہیں لگ رہا؟ عرض کیا بادشاہ سلامت! کڑوا تو بہت ہے۔ بادشاہ نے کہا: آپ تو بڑے آرام سے کھا رہے ہیں۔ کہنے لگا

''مجھے خیال آیا ہے کہ آپ کے جن ہاتھوں سے میں زندگی میں سینکڑوں مرتبہ میٹھی چیزیں لے کر کھا چکا ہوں، اگر ان ہاتھوں سے آج کڑوی چیز بھی مل گئی ہے تو میں اس کو کیسے واپس کروں، لہذا مجھے واپس کرتے ہوئے شرم محسوس ہوئی اور میں نے کڑوی چیز بھی کھالی''۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کاش! ہمارے اندر بھی یہ خوبی پیدا ہو جائے کہ ہم ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استعمال کرتے ہوئے اس کی شکر گزاری بجالائیں۔ جس پروردگار نے ہمیں ہزاروں خوشیاں عطا فرمائیں اگر کبھی کوئی غم اور تکلیف کی بات بھی پیش آجائے تو ہمیں چاہئے کہ ہم نہ تو اللہ تعالیٰ کا شکوہ کریں اور نہ ہی اس کا در چھوڑیں۔ آج تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی انتہا نہیں اس کے باوجود ہمیں شکر کرنے کا پتہ ہی نہیں۔

ایک دوسرے واقعہ میں لکھا ہے کہ سلطان محمود غزنویؒ کے مصاحبین نے انہیں یہ شکایت لگائی کہ بادشاہ سلامت! ایاز کی ایک الماری ہے یہ اس الماری کو تالا لگا کر رکھتا ہے، وہ روزانہ اس الماری کو کھول کر دیکھتا ہے اور کسی دوسرے بندے کو دیکھنے نہیں دیتا۔ ہمارا خیال ہے کہ اس نے آپ کے خزانے کے قیمتی ہیرے اور موتی اس کے اندر چھپا کر رکھے ہوئے ہیں، آپ ذرا اس کی تلاشی لیجئے۔

جب بادشاہ کو یہ شکایت لگائی گئی تو بادشاہ سلامت نے اسی وقت ایاز کو بلوایا اور کہا، ایاز! کیا تمہاری کوئی الماری ہے؟ اس نے کہا، جی ہے۔

پوچھا کیا اسے تالا لگا کر رکھتے ہو؟

اس نے کہا جی ہاں

پوچھا کسی اور کو دیکھنے دیتے ہو؟

عرض کیا جی نہیں

پھر پوچھا کیا تم خود اسے روزانہ دیکھتے ہو؟

عرض کیا جی ہاں

پھر بادشاہ نے فرمایا کہ چابی لاؤ۔ ایاز نے چابی دے دی۔ بادشاہ نے کسی بندے کو بھیجا کہ جاؤ اور اس الماری میں جو کچھ موجود ہے وہ سب کچھ لا کر یہاں سب کے سامنے پیش کر دو۔ وہ حاسدین بڑے خوش ہوئے کہ دیکھو اب اس کی حقیقت کھل جائے گی۔

جب اس کی چوری کا سامان سامنے آئے گا تو بادشاہ ابھی اس کو یہاں سے دھکے دے کر نکال دے گا۔

اللہ کی شان کہ جب وہ بندہ واپس آیا تو اس نے آ کر بادشاہ کے سامنے تین چیزیں رکھ دیں۔ ایک پرانا جوتا، ایک پرانا تہہ بند اور ایک پرانا کرتہ

بادشاہ نے پوچھا اس میں کچھ اور نہیں تھا؟ اس نے کہا، جی نہیں۔ پھر بادشاہ نے ایاز کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا، ایاز! کیا اس میں کچھ اور نہیں ہے؟

اس نے کہا جی نہیں، یہی کچھ تھا۔

بادشاہ نے کہا: ایاز! اس میں تو کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں ہے جسے تم تالے میں بند کر کے رکھو اور کسی دوسرے کو دیکھنے بھی نہ دو اور کوئی ایسی چیز بھی نہیں کہ جسے تم روزانہ آ کر چیک کرو کہ ٹھیک ہے یا نہیں۔

اس نے: بادشاہ سلامت! بات یہ ہے کہ میرے نزدیک یہ بہت قیمتی ہیں۔

بادشاہ نے پوچھا بھئی! وہ کیسے؟

اس نے کہا: بادشاہ سلامت! وہ اس لیے کہ جب میں آپ کے دربار میں پہلی مرتبہ آیا تھا تو

یہ جوتے پہنے ہوئے تھا، یہ تہہ بند باندھا ہوا تھا اور یہ کرتا پہنا ہوا تھا۔ میں نے ان تینوں چیزوں کو محفوظ کر لیا تھا۔ اب میں روزانہ الماری کھول کر ان کو دیکھتا ہوں اور اپنے نفس کو سمجھاتا ہوں کہ ایاز! تمہاری اوقات یہی تھی، تم اپنی اوقات نہ بھولنا، اب تمہیں جو کچھ ملا ہے یہ سب تمہارے بادشاہ کا تم پر احسان ہے۔ لہذا تم اپنے بادشاہ کا احسان سامنے رکھنا۔ بادشاہ سلامت! اس طرح مجھے اپنی اوقات یاد رہتی ہے کہ میں کیا تھا اور مجھے بادشاہ کے قرب نے کیا کیا عزتیں بخشیں۔

کاش ہماری بھی یہی کیفیت ہو جاتی کہ ہم اللہ رب العزت کی نعمتوں کا استحضار رکھتے اور اپنی اوقات کو یاد رکھتے۔ ہمیں تو ذرا سا کچھ مل جاتا ہے تو سب سے پہلے اپنی اوقات بھولتے ہیں۔

ایک دن بادشاہ نے اپنے خزانے سے ایک قیمتی ہیرا منگوایا۔ پھر ایک ہتھوڑی منگوائی اور اپنے درباریوں سے کہا کہ آج میں تمہاری ذہانت کا امتحان لیتا ہوں۔ انہوں نے کہا، جی بہت اچھا۔ اب اس بادشاہ نے اپنے ایک درباری کو ہیرا دیا اور ساتھ ہی ہتھوڑا بھی پکڑا دیا۔ پھر اسے کہا کہ اسے توڑو۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ تو ہماری عقل کا امتحان ہے۔ چناں چہ وہ کہنے لگا، بادشاہ سلامت! یہ ہیرا تو بڑا قیمتی ہے، یہ تو آپ کے خزانے میں ہی سجتا ہے لہذا اسے نہیں توڑنا چاہئے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر کہا بہت اچھا۔ وہ سمجھا کہ میرا جواب بالکل ٹھیک ہے۔ پھر بادشاہ نے وہ ہیرا دوسرے درباری کو دیا۔ اس نے بھی توڑنے سے معذرت کر لی۔ اس کے الفاظ مختلف تھے مگر مفہوم ایک ہی تھا۔ پھر تیسرے کو دیا تو اس نے بھی معذرت پیش کر دی۔ پھر چوتھے نے بھی عذر کر دیا۔ حتی کہ بھرے دربار میں جس کو بھی ہیرا دیا سب نے ہیرے کو بڑا قیمتی سمجھا اور اس کو توڑنے سے سب نے معذرت کر لی۔ آخر پر ایاز بیٹھا تھا۔ اب بادشاہ نے ہیرا اسے پکڑا دیا اور ساتھ ہی ہتھوڑا بھی دے دیا اور کہا: ایاز! اس کو توڑ دو۔ ایاز نے اسے زمین پر رکھا اور ہتھوڑا مار کے اس ہیرے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ جب لوگوں نے دیکھا تو وہ کہنے لگے کہ یہ اتنا بے وقوف اور کم عقل ہے کہ اس نے شاہی خزانے کا اتنا بڑا نقصان کر دیا، آج تو بادشاہ اس کو ضرور نکال دے گا۔

جب بادشاہ نے ہیرا ٹوٹا ہوا دیکھا تو پوچھا: ایاز! تم نے تو ہیرے کو توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

ایاز نے جواب دیا: بادشاہ سلامت! میرے سامنے دو صورتیں تھیں۔ یا تو میں آپ کا حکم مان کر ہیرے کو توڑ دیتا یا پھر ہیرے کو بچا کر آپ کا حکم توڑ دیتا۔ میری نظر میں آپ کا حکم ایسے ہزاروں ہیروں سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لیے میں نے ہیرے کو توڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا مگر میں نے آپ کا حکم نہیں توڑا۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جیسی ایاز کے دل میں بادشاہ کے حکم کی قدر و قیمت تھی، کاش کہ حکمِ خدا کی وہ عظمت ہمارے دل میں بھی آ جاتی۔

میں کس کا حکم توڑ رہا ہوں؟

محترم جماعت! اگر بندہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو توڑنے لگے تو ستر دفعہ سوچے کہ میں کس کا حکم توڑ رہا ہوں۔ اس لیے کہ جب بندہ اللہ رب العزت کے حکم کو اور اس کی حدود کو توڑتا ہے تو پروردگا کو اس پر اس طرح جلال آتا ہے جیسے شیر کو اپنا شکار دیکھ کر جلال آتا ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کو جلال میں دیکھیں گے تو پھر ہمارا کیا بنے گا؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا ارشاد فرمایا ہے کہ

تلک حدود الله فلاتقربوها (البقرۃ:۱۸۲)

یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدود ہیں تم ان کے قریب بھی نہ جاؤ

لہٰذا سالکین کو چاہئے کہ وہ اللہ رب العزت کے حکم کی عظمت اپنے دل میں پیدا کریں اور ان کو یہ احساس رہے کہ جو کچھ بھی ہو ہم نے اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں توڑنا۔ یہ تصوف کا پہلا قدم ہے۔

ایک شیطانی عمل

چوں کہ آج کا انسان من پسند کی نعمتیں کھاتا پیتا ہے اس لیے پیٹ بھرا بنا پھرتا ہے اور اس کے دل میں اللہ رب العزت کی نعمتوں قدر و قیمت نہیں ہے۔ اسی وجہ سے اس کی طبیعت کے اندر ضد، عناد اور

ہٹ دھرمی ہے۔ ہٹ دھرمی کیا ہوتی ہے؟ ہٹ دھرمی یہ ہے کہ بات بھی غلط کرنا اور اس کے اوپر ڈٹ بھی جانا۔ بجائے شرمندہ ہونے کے تاویلیں نکالنا اور اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ یاد رکھیں کہ ہٹ دھرمی ایک شیطانی عمل ہے اس لیے دنیا میں سب سے پہلے ہٹ دھرمی شیطان نے کی تھی۔ آج یہ ہٹ دھرمی اتنی عام ہو چکی ہے کہ شاید سو میں سے نوے سے زیادہ بندے آپ کو اس کے مریض نظر آئیں گے۔ گھروں میں دیکھو کہ بیوی بات کرتی ہے تو کہتی ہے کہ بس اب تو میں نے بات کر دی ہے۔ خاوند سے لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے تو ڈٹی رہتی ہے، وہ دل میں سمجھتی بھی ہے کہ میں غلط کر رہی ہوں لیکن پھر بھی بات نہیں مانتی۔ اسی طرح خاوند بھی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں بیوی پر ظلم کر رہا ہوں اور شریعت کے حکموں کو توڑ رہا ہوں لیکن پھر بھی وہ اپنی ضد پر ڈٹا رہتا ہے۔ اسی طرح دو بھائیوں میں کوئی چھوٹی سی بات بھی ہو جائے تو وہ اپنی اپنی بات پر ڈٹ جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے پر مقدمے چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے لاکھوں روپے لگ جاتے ہیں لیکن وہ اپنی اپنی بات پر ڈٹے ہوئے ہوتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

معافی مانگنے میں عظمت ہے

میرے دوستو! ایک جملہ بہت خوبصورت اور پیارا ہے۔ کون سا جملہ؟ وہ جملہ یہ ہے کہ "غلطی ہوگئی ہے معاف کر دیجئے" اگر ہم یہ کہنا سیکھ لیں تو ہمارے کئی جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔ اگر کسی موقع پر خاوند اپنی بیوی سے ناراض ہو جائے اور بیوی یہ کہہ دے کہ غلطی ہوگئی ہے معاف کر دیجئے تو خاوند معاف کر دے گا۔ اگر بیٹے سے باپ ناراض ہو جائے اور بیٹا آگے سے کہہ دے کہ ابو غلطی ہوگئی ہے معاف کر دیجئے تو باپ ناراض ہونے کے بجائے خوش ہو جائے گا۔ دوست دوست کے درمیان جھگڑا ہو گیا، اگر ان میں سے ایک کہتا ہے کہ بھئی! غلطی ہوگئی ہے، معاف کر دیجئے تو بڑے بڑے جھگڑے ختم ہو جائیں گے۔ مگر ہمیں یہ الفاظ آج تک کسی نے سکھائے ہی نہیں۔ یہ پیر و مرشد کا کام

ہوتا ہے۔ یاد رکھیں کہ آج غلطیوں کی معافی ایک دوسرے سے مانگ لینا بہت آسان ہے لیکن قیامت کے دن ان فیصلوں کو نمٹانا بہت مشکل ہوگا۔ قیامت کے دن جس کو کھڑا کیا گیا کہ تم ذرا بتاؤ کہ تم نے فلاں کو کمینہ کیوں کہا تھا؟ فلاں کو ذلیل کیوں کہا تھا؟ فلاں کو بے ایمان کیوں کہا تھا؟ اگر وہاں ثابت نہ کر سکے تو پھر ہماری کیا درگت بنے گی؟ اسی لیے آج ایک دوسرے سے معافی مانگنے کی عادت ڈال لیں۔ یہ بہت اچھی عادت ہے۔ یہ حضرت آدم علیہ السلام کی صفت ہے اور اسی میں عظمت ہے۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے گندم کا خوشہ کھایا تو ان پر پروردگا عالم کا عتاب نازل ہوا۔ چناں چہ پروردگار عالم نے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اس کے کھانے سے منع نہیں کیا تھا۔ یعنی جب منع کیا تھا تو پھر تم نے کیوں کھایا؟ آگے حضرت آدم علیہ السلام نے یہ نہیں کیا کہ

اے اللہ! مجھ سے بھول ہوگئی تھی۔

میں سمجھا کہ وہ ممنوعہ درخت اور ہوگا۔

میں نے ارادے سے یہ کام نہیں کیا۔

بلکہ فقط ایک سیدھی سی بات کی کہ

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخٰسرین.

(الاعراف:۲۳)

اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں اور رحمت نہ فرمائیں تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہوجائیں گے۔

تو پتہ چلا کہ غلطی کو مان لینا حضرت آدم علیہ السلام کی صفت ہے۔ لہٰذا مومن بندہ وہ ہوتا ہے جو اپنی غلطی کو جلدی تسلیم کرلے۔ آج کل تو غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اکثر جھوٹ بولتے ہیں۔ سروس میں دیکھ لیجئے دفتر کا کلرک اپنی غلطیوں کو چھپانے کے لیے افسر کے سامنے جھوٹ بولتا ہے۔ بلکہ پتہ نہیں کہ جھوٹ کی ایک سیریز ہی چل پڑتی ہے۔ کیا یہ سب سے آسان نہیں ہے کہ غلطی کو تسلیم ہی کرلیا

جائے۔ اگر افسر کہے کہ آپ نے یہ کام غلط کیا ہے تو وہ کہے، جی مجھ سے غلطی ہوگئی ہے، میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ اس طرح وہ افسر ناراض ہونے کے بجائے الٹا اس سے راضی ہوجائے گا۔

اس کے برعکس دیکھیں کہ شیطان بھی غلطی کی تھی۔ جب پروردگارِ عالم کے حکم کے باوجود بھی ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا تو اللہ تعالی نے ابلیس سے پوچھا، اے ابلیس! تم نے سجدہ کیوں نہ کیا؟ تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرلیتا، الٹا اس کی Reason (وجہ) بتانے لگا کہ میں اس پر فضیلت رکھتا ہوں کیوں کہ

خلقتنی من نار و خلقته من طین (ص:۷٦)

پروردگار! مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے پیدا کیا۔

جب ابلیس نے اپنی غلطی کے باوجود ہٹ دھرمی کا اظہار کیا تو اللہ رب العزت نے فرمایا:

فاخرج منها فانک رجیم (ص:۷۷)

پس تو نکل جا میرے دربار سے تو مردود ہے۔

دیکھا جو خدا کے حکم کو توڑتا ہے پھر پرودگارِ عالم اس کا کیسا حشر فرماتے ہیں۔ نہ صرف یہی کہ دربار سے نکال دیا بلکہ فرما دیا کہ

ان علیک لعنتی الی یوم الدین۔ (ص:۷۸)

بے شک تیرے اوپر قیامت تک میری لعنتیں برسیں گی۔

تو جو بھی بندہ غلطی کرے گا اور الٹا ہٹ دھرمی کا بھی مظاہرہ کرے گا تو پھر اللہ تعالی اس کے ساتھ وہی معاملہ فرمائیں گے جو شیطان کے ساتھ کیا تھا حضرت آدم علیہ السلام کو ادب و احترام سے یاد کیا جاتا ہے جب کہ شیطان مردود سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی نہ مانے تو کرکے دیکھ
جنت بھی ہے دوزخ بھی ہے نہ مانے تو مرکے دیکھ

یہودیوں کا ایک بڑا جرم

آج ہٹ دھرمی حد سے بڑھ گئی ہے۔ چھوٹا بھائی بڑے کی بات نہیں مانتا۔ وہ آگے سے Logic پیش کرتا ہے۔ بیٹا ماں کی بات نہیں مانتا اور آگے سے Logic پیش کر دیتا ہے۔ اس ہٹ دھرمی کے گناہ سے کوئی بھی توبہ نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی صاحب علم کوئی غلط مسئلہ بیان کر بیٹھے تو پھر وہ ہار نہیں مانتا۔ بلکہ کتابیں تلاش کرتا ہے کہ مجھے اپنی اس بات کی کہیں سے کوئی تائید مل جائے۔ اب وہ قرآن وحدیث میں رب کی منشا تلاش کرنے کے بجائے اپنی منشاء کو ڈھونڈے گا۔ یاد رکھیں کہ اس سے گمراہی بڑھتی ہے۔ یہودیوں کا بھی یہی بڑا جرم تھا کہ وہ ایک بات کر دیتے تھے اور پھر اللہ کی کتاب تورات میں سے اپنی منشا کو تلاش کرتے تھے کہ کہیں سے ہماری بات کی سپورٹ میں کوئی آیت مل جائے۔ اس لیے ان کو پھٹکار دیا گیا۔

حقوق العباد معاف کروانے کی ضرورت

یاد رکھیں کہ اگر اپنی غلطی کو تسلیم کر کے جلدی معافی مانگ لی جائے تو بندے کے بڑے بڑے مسئلے منٹوں میں حل ہو جائیں گے۔ اگر ہم نے اللہ رب العزت کے حقوق ضائع کیے تو اللہ تعالیٰ جلدی معاف فرما دیں گے مگر حقوق العباد اللہ کے بندوں سے معاف کروانے پڑیں گے۔

سوچیں تو سہی کہ ہم نے

کتنوں کی غیبت کی

کتنوں پر بہتان لگائے

کتنوں سے حسد کیا

کتنوں کا دل دکھایا

کتنوں سے بدگمانی کی

کتنوں سے بدزبانی کی

کتنوں کو ہاتھوں سے تکلیف پہنچائی

کتنے رشتوں کو زبان کی تلوار سے کاٹا

لیکن کیا ہم نے کبھی کسی سے معافی مانگی ہے؟ دیکھنے میں تو صوفی بنے پھرتے ہیں لیکن یاد رکھنا کہ یہ ورد وظیفے کسی کام نہیں آئیں گے۔ جہاں حقوق العباد کا معاملہ آجائے گا وہاں معافی مانگنی پڑے گی۔ لہذا آج ہی سے اس کو عادت بنا لیجئے۔ دنیا میں معافی مانگنا آسان ہے اور قیامت کے دن اس کا جواب دینا مشکل کام ہے۔

گائے کا فیصلہ

محمد شاہ مکران کا ایک بادشاہ گزرا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ شکار کو نکلا۔ بادشاہ سلامت شکار کھیل رہے تھے۔ سپاہیوں کے ہاتھ ایک بوڑھی عورت کی گائے آگئی۔ انہوں نے اسے ذبح کر کے اس کا گوشت بھون کر کھالیا۔ بڑھیا نے کہا کہ مجھے کچھ پیسے دے دو تاکہ میں کوئی اور گائے خرید لوں۔ انہوں نے پیسے دینے سے انکار کر دیا۔ اب وہ بڑی پریشان ہوئی۔ اس نے کسی عالم کو بتایا کہ میرا تو روزی کا دارومدار اسی گائے پر تھا، یہ سپاہی اس کو بھی کھا گئے ہیں اور اب پیسے بھی نہیں دیتے، اب میں کیا کروں انہوں نے کہا کہ بادشاہ نیک آدمی ہے لہذا تم ڈائریکٹ جا کر بادشاہ سے بات کرو۔ اس نے کہا کہ مجھے یہ سپاہی آگے جانے نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہیں ایک طریقہ بتا دیتا ہوں کہ بادشاہ نے پرسوں اپنے گھر واپس جانا ہے۔ اس کے گھر کے راستے میں ایک دریا ہے اور اس کا ایک ہی پل ہے۔ وہ اس پل پر لازمی گزرے گا۔ تم اس پل پر پہنچ جانا اور جب بادشاہ کی سواری وہاں سے گزرنے لگے تو اس کی سواری ٹھہرا کر تم اپنی بات بیان کر دینا۔ چناں چہ تیسرے دن بڑھیا وہاں پہنچ گئی۔

بادشاہ کی سواری پل پر پہنچی تو پہلے ہی انتظار میں تھی۔اس نے کھڑے ہوکر بادشاہ کی سواری کوروک لیا۔ بادشاہ نے کہا، اماں! آپ نے میری سواری کو کیوں روکا ہے، بڑھیا کہنے لگی، محمد شاہ! میرا اور تیرا ایک معاملہ ہے، اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ تو وہ معاملہ اس پل پر حل کرنا چاہتا ہے یا قیامت کے دن پل صراط پر حل کرنا چاہتا ہے؟ پل صراط کا نام سنتے ہی بادشاہ کی آنکھوں سے آنسو آ گئے وہ نیچے اترا اور کہنے لگا،''اماں میں اپنی پگڑی آپ کے پاؤں پر رکھنے کو تیار ہوں، آپ مجھے بتائیں کہ آپ کو کیا تکلیف پہنچی ہے؟ مجھے معافی دے دو میں قیامت کے دن پل صراط پر کسی جھگڑے کا سامنا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔'' چناں چہ اس بڑھیا نے اپنی بات بتادی۔ بادشاہ نے اسے ستر گایوں کے برابر قیمت بھی دے دی اور معافی مانگ کے اس بڑھیا کو راضی بھی کیا تا کہ قیامت کے دن پل صراط پر اس کا دامن نہ پکڑے۔

مجاہدین کا معافی مانگنا

ہمارا تو یہ حال ہے کہ غلطی بھی کرتے ہیں اور پھر معافی بھی نہیں مانگتے اور اللہ والوں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ نیکیاں بھی کر رہے ہوتے ہیں اور پھر اللہ سے معافی بھی مانگ رہے ہوتے ہیں کہ اے اللہ! جیسے نیکی کرنے کا حق تھا ہم وہ حق ادا نہ کر سکے۔قرآن عظیم الشان سے اس کی دلیل ملتی ہے۔ جو لوگ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنے گھروں سے نکلتے ہیں اور جہاد کرتے ہیں ان کے بارے میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں

وکاین من نبی قاتل معه ربیون کثیرون فما وهنوا لما اصابهم فی سبیل الله وما ضعفوا ومااستکانوا والله یحب الصابرین۔(آل عمران:۱۴۶)

اور بہت سے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ ہوکر بہت سے اللہ والے لڑے، نہ تو انہوں نے ہمت ہاری ان مصائب کی وجہ سے جو ان پر اللہ کی راہ میں آئے اور نہ وہ کمزور پڑے اور نہ وہ

دبے، اللہ تعالی کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبت ہے۔

جو اتنی استقامت کے ساتھ اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے تھے وہ اپنے اس عمل کو پیش کر کے احسان نہیں جتلا رہے تھے بلکہ وہ یہ کہہ رہے تھے:

ربنا اغفرلنا ذنوبنا واسرافنا فی امرنا۔(آل عمران:۱۴۷)

اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو اور ہمارے حد سے نکل جانے کو معاف فرما دیجئے۔

حضرت نوح علیہ السلام کا معافی مانگنا

اس سے ذرا اور اونچی بات سن لیجئے۔ سیدنا نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ آپ کی قوم نے آپ کی بہت نافرمانی کی ہے، اب ہم آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو بچالین گے اور ان سب کو نیست و نابود کر دیں گے۔ چناں چہ آپ ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا لیجئے اور ظالموں کے بارے میں سفارش نہ کیجئے۔

جب طوفان آیا اور ایمان والے کشتی پر سوار ہو گئے تو سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جس کے عمل اچھے نہیں تھے فرمایا:

یٰبنی ارکب معنا۔(ہود:۴۲)

اے میرے بیٹے ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا

مگر بیٹا کہنے لگا کہ میں اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جاؤں گا اور یہ مجھے پانی سے بچا دے گی۔ ابھی گفت وشنید ہو ہی رہی تھی کہ اسی دوران ایک موج آئی اور بیٹا باپ کی آنکھوں کے سامنے پانی میں غرق ہو گیا۔

چوں کہ اللہ تعالی نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کے اہل خانہ کو بچالوں گا اس لیے شفقتِ پدری نے جوش مارا اور پروردگارِ عالم سے دعا کی:

ان ابنی من اھلی و ان وعدک الحق و انت احکم الحاکمین (ہود:۴۵)

اے پروردگار! میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا، اور آپ کا وعدہ سچا ہے، اور آپ سب سے بڑے حاکم ہیں۔

بس اتنی سی بات کہنی تھی کہ پروردگار کی طرف سے جلال بھرا خطاب آیا کہ

انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح۔(ہود:۴۶)

اے نوح! یہ آپ کے اہل میں سے نہیں تھا، اس کے اعمال اچھے نہیں تھے۔

اور آگے پروردگار نے اور بھی بات کر دی۔ ذرا دل تھام کے سن لیجئے۔ فرمایا:

فلاتسئلن مالیس لک بہ علم، انی اعظک ان تکون من الجاھلین ۔ (ہود:۴۶)

اے نوح! آپ مجھ سے وہ مت پوچھئے جس کا علم نہیں، میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں، ایسا نہ ہو کہ آپ کہیں جاہلوں میں سے ہو جائیں۔

اللہ تعالی کا یہ جلال بھرا خطاب سن کر سیدنا نوح علیہ نے نہ کوئی عذر پیش کیا اور نہ ہی کوئی Logic پیش کی بلکہ معافی مانگتے ہوئے فوراً عرض کیا:

رب انی اعوذ بک ان اسئلک مالیس لی بہ علم والا تغفرلی وترحمنی اکن من الخٰسرین۔(ہود:۴۷)

اے رب! میں آپ سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں آئندہ آپ سے ایسی بات کا سوال کروں جس کے بارے میں نہیں جانتا۔ اور اگر آپ میری مغفرت نہیں فرمائیں گے اور مجھ پر رحم نہ فرمائیں گے تو میں تباہ ہی ہو جاؤں گا۔

ربِ کریم ہمیں بھی سمجھ عطا فرمائے اور ہمیں بھی اسی دنیا میں اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کی توفیق عطا فرمادے۔(آمین ثم آمین) ☆☆☆

خبرنامہ

مفاد عامہ کی عرضی پر سماعت کرنے سے سپریم کورٹ کا انکار۔

سابق جج کی نگرانی میں ووٹر لسٹ میں ہیرا پھیری کی تحقیقات کی درخواست خارج

نئی دہلی (یو این آئی) سپریم کورٹ نے پیر کے روز مفاد عامہ کی عرضی پر سماعت کرنے سے انکار کر دیا جس میں کسی سابق جج کی سربراہی میں خصوصی تحقیقاتی ٹیم (ایس آئی ٹی) کے ذریعہ بنگلور سنٹرل مہادیو پورہ اسمبلی حلقہ اور ملک بھر کے دیگر متاثرہ حلقوں میں بڑے پیمانے پر ووٹر لسٹ میں ہیرا پھیری کے الزمات کی تحقیقات کے لیے ہدایت دینے کی درخواست کی گئی تھی۔

جسٹس سوریہ کانت اور جائما لیا باگچی کی بنچ نے ایڈوکیٹ روہت پانڈے کی طرف سے دائر عرضی کو یہ کہتے ہوئے خارج کر دیا کہ ہم مفاد عامہ میں دائر کی جانے والی اس رٹ پٹیشن پر غور کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ تاہم عدالت عظمی نے کانگریس کے رکن درخواست گزار کو الیکشن کمیشن کے سامنے معاملہ اٹھانے کی اجازت دی۔ بنچ نے کہا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو وہ اس معاملے کو الیکشن کمیشن کے سامنے اٹھا سکتا ہے۔

درخواست گزار کے وکیل نے موقف اختیار کیا کہ الیکشن کمیشن میں درخواست دائر کی گئی۔ عرضی گزار نے ۷/ اگست ۲۰۲۵ کو پریس کانفرنس میں لوک سبھا میں اپوزیشن لیڈر راہل گاندھی کی طرف سے لگائے گئے الزامات کا حوالہ دیا۔ مفاد عامہ کی عرضی میں کہا گیا ہے کہ یہاں جو چیز داؤ پر لگی ہے وہ کسی ایک انتخابی مقابلے کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ووٹر لسٹ کا اعتبار ہے، جس پر پورا جمہوری عمل منحصر ہے۔ پٹیشن میں دعوی کیا گیا ہے، جب ووٹر لسٹ خامی اور دھوکہ دہی سے داغدار ہوتی ہیں، تو ووٹ ڈالنے کا حق اب تمام شہریوں کے لیے یکساں طور پر قابل رسائی نہیں رہ جاتا ہے۔ یہ ہر عاقل بالغ فرد کی یکساں رائے دہی کے آئینی وعدے کو کمزور کرتا ہے۔ درخواست میں الیکشن کمیشن کو یہ ہدایت دینے کی درخواست کی گئی تھی کہ وہ ووٹر لسٹوں میں مزید ترمیم یا حتمی شکل نہ دے جب تک کہ عدالت کی ہدایات پر عمل نہیں کیا جائے اور ووٹر لسٹوں کا آزادانہ جائزہ مکمل نہ ہو جائے درخواست میں عدالت عظمی سے یہ بھی استدعا کی گئی کہ وہ ووٹر لسٹوں کی تیاری اور اشاعت میں شفافیت اور احتساب کو یقینی بنانے کے لیے الیکشن کمیشن کے لیے پابند گائیڈ لائنز مرتب کرے۔

(بشکریہ روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ ۱۴/۱۰/ اکتوبر ۲۰۲۵ء)